ہندوستان کی جنگ آزادی میں
مسلمانوں کا حصّہ
ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی

ہندوستان کی جنگ آزادی
میں
مسلمانوں کا حصہ

ہندوستان کی جنگ آزادی
میں
مسلمانوں کا حصہ

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی
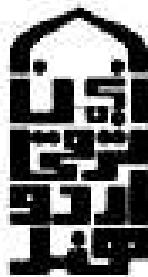
انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۴۹

سن اشاعت : ۲۰۰۸ء

قیمت : ۱۰۰؍روپے (۱۰؍امریکی ڈالر)

ڈیزائن سرورق : جاوید رحمانی

بہ اہتمام : اختر زماں

کمپوزنگ : عارفہ خانم، جاوید رحمانی، محمد ساجد

طباعت : اصیلہ آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی

Hindustan Ki Jang-e- Azadi Mein Musalmanon Ka Hissa

by : **Dr. Md. Muzaffaruddin Farooqui**

Price : 100.00 (10.00 Dollars)

2008

ISBN : 81-7160-144-8

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

Urdu Ghar : 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002

Phone : 011-23236299-23237210, Fax : 011-23239547

E-mail: urduadabndli@bol.net.in , anjuman.urdughar@gmail.com

انتساب

اس کتاب کو ہم
جنگِ آزادی کے اُن لاکھوں سپاہیوں کے نام
معنون کرتے ہیں
جن کے نام نامی تاریخ کے صفحات پر درج نہیں ہوئے
لیکن ان کے خون کی سرخی
ہندوستان کی رنگارنگ تہذیب اور یک جہتی کو
سرخ رو کر چکی تھی
اور آج بھی فرزندانِ وطن کو محبت اور اتحاد
کی دعوت دے رہی ہے۔

سوانحی خاکہ

نام : محمد مظفر الدین فاروقی

تاریخ و مقام پیدائش : ۹ر نومبر ۱۹۳۵ء، گھم پلی، ضلع میدک، آندھرا پردیش۔ انڈیا

والد کا نام : محترم شیخ مہتاب پٹیل (شہید)

والدہ کا نام : محترمہ غوثیہ بیگم (مرحومہ)

تعلیم : پی۔ ایچ۔ ڈی (کیمسٹری) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انڈیا
ایم۔ ایس۔ سی (کیمسٹری) عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد۔ انڈیا

پیشہ : لکچرار کیمسٹری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (۶۲-۱۹۶۳)
سائنٹفک آفیسر، ریجنل ریسرچ لیباریٹری، حیدرآباد (۶۳-۱۹۶۷)
پوسٹ ڈاکٹر فیلو، اکران یونیورسٹی، اکران۔ امریکہ (۶۷-۱۹۶۸)
کلینیکل کیمسٹ، ہولی فیملی ہاسپٹل، شکاگو۔ امریکہ (۶۸-۱۹۹۵)

سماجی اور تعلیمی خدمات : صدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی الستائی ایسوسی ایشن آف شکاگو (۸۶-۲۰۰۳)
سکریٹری جنرل، انڈو اسلامک فاؤنڈیشن آف امریکہ

شریک حیات : بلقیس بیگم

اولاد : ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ثمینہ غوثیہ ریف، زبیر احمد فاروقی، افشاں نکہت
: فاروقی، ذاکرہ صدف فاروقی (پوتی)، زکریا رشید ریف (نواسہ) جواد
احمد فاروقی (پوتا)، مرجان ہدیٰ فاروقی (پوتی) اور فرقان احمد فاروقی (پوتا)

بھائی : محمد ریاض الدین فاروقی (حیدرآباد)، محمد نجم الدین فاروقی (امریکہ)
محمد جلال الدین فاروقی (امریکہ)، محمد عارف الدین فاروقی (حیدرآباد)
اور محمد افتخار الدین فاروقی (مرحوم)

بہن : خالدہ ادیب خانم (امریکہ) اور فہمیدہ انیس خانم (امریکہ)

تصانیف : تین ملک ایک کہانی (افسانے)، ناموس کا اغوا (افسانے)
ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ۔ اسباب و علل

فہرست

حرفِ آغاز

محمد مظفرالدین فاروقی صاحب کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ زندگی میں ان کی دل چسپیاں بہت مختلف رہی ہیں۔ جس میدان میں اُنھوں نے قدم رکھا ہے، اُن کی حیثیت ممتاز ترین انسان کی رہی ہے۔ بنیادی طور پر وہ سائنسٹ ہیں۔ اُنھوں نے عثمانیہ یونی ورسٹی (حیدرآباد) سے کیمسٹری سے ایم۔ایس۔سی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ چند سال علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں لیکچرر رہنے کے بعد وہ حیدرآباد ریجنل ریسرچ لیبارٹری میں سائنٹفک افسر کے عہدے پر فائز ہو گئے اور مختلف ملازمتیں کرنے کے بعد وہ شکاگو چلے گئے۔ جہاں ہولی فیملی ہاسپٹل میں کلینیکل (Clinical) کیمسٹ کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو گیا۔ 1995ء میں وہ ریٹائر ہو گئے۔

محمد مظفرالدین فاروقی صاحب کو ادب سے غیر معمولی دل چسپی ہے۔ اُن کا اصل میدان افسانہ نگاری ہے۔ اُن کا افسانوں کا پہلا مجموعہ 'تین ملک۔ ایک کہانی' دوسرا مجموعہ 'ناموس کا اغوا' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ افسانوں کا تیسرا مجموعہ 'آشوبِ جہاں' کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔ تاریخ کے موضوع پر اُن کی کتاب 'ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کا خاتمہ۔ اسباب وعلل' بھی شائع ہو چکی ہے۔

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ایک سو پچاس سال بعد ہندوستان میں بہت بڑے پیمانے پر ۱۸۵۷ء کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بعض کتابیں ایسی ہیں جن میں جنگِ آزادی میں مسلمانوں کے حصّے کو قصداً یا نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

مورخین اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب اور اس سے پہلے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ اہم رول رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں دلی ہو یا ہندوستان کا کوئی اور شہر، برطانوی فاتحین نے سب سے زیادہ ظلم و ستم مسلمانوں پر کیا۔ بہت بڑی تعداد میں بغاوت کے الزام میں پھانسی کے تختوں پر جن ہندوستانیوں کو لٹکایا گیا اور جن کے پورے پورے خاندانوں کو نیست و نابود کر دیا گیا، اُن میں سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی اور ۱۹۴۷ء تک عام طور سے اس حقیقت کو تسلیم کیا جاتا رہا۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے

بعد سے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء اور تحریک آزادی میں مسلمانوں کا جو حصہ رہا ہے، اُسے دانستہ طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان میں قومی یک جہتی اور اتحاد کے فروغ کے لیے ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں جنگِ آزادی میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی جدوجہد اور قربانیوں کا ایمان داری سے اعتراف کیا جائے۔ یہ ضرورت محمد مظفر الدین فاروقی صاحب کی کتاب سے پوری ہوتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عمومی رول کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سامراجی حکومت کے ظالمانہ نظام سے پیدا ہونے والے نتائج اور پھر جنگِ ۱۸۵۷ء کے پسِ منظر، جنگ کی تیاری، پلاننگ اور عسکری جدوجہد کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ہندوستانی علما کے رول کو تاریخی حقائق کی روشنی میں بہت ہی جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور یہ صرف اس لیے ممکن ہو سکا کہ محمد مظفر الدین فاروقی صاحب ایک سیکولر، ذہین اور باشعور دانشور ہیں۔ ہندوستان کی قدیم اور موجودہ تاریخ پر اُن کی گہری نظر ہے اور وہ صاحبِ بصیرت فن کار ہیں، اس لیے وہ ایسے اہم موضوع کے ساتھ انصاف کر سکے ہیں۔

شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے حال ہی میں 'ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا حصہ' کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس موضوع پر ایک سیمنار کیا گیا تھا۔ اُس میں جو مقالے پڑھے گئے تھے، اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا تھا۔ مگر محمد مظفر الدین فاروقی صاحب کی کتاب 'ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ' مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ مفصل تصنیف ہے۔ شروع سے آخر تک اس کتاب کے مطالعے سے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ کا ہمیں علم ہو جاتا ہے۔

خلیق انجم

دیباچہ

ہندوستان کو آزاد ہوئے پورے ۶۰ سال ہو رہے ہیں۔ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر کی کوکھ سے آزاد ہندوستان اور ایک نیا ملک پاکستان پیدا ہوئے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے برصغیر کے عوام نے غیر معمولی قربانیاں دی ہیں۔ انگریز سامراجیت جب اپنا جال پھینک رہی تھی اس وقت اور جب سونے کی چڑیا پوری طرح جال میں پھنس چکی تھی اس وقت بھی برصغیر کے طول وعرض میں ایک دن بھی ایسا نہیں آیا کہ عوام نے بددل ہو کر ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزوں نے پہلے سو سال ایسٹ انڈیا کمپنی کی آڑ میں لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی کی بدترین مثال قائم کی۔ اس کے نتیجے میں عوام نے تنگ آکر ۱۸۵۷ء میں ہتھیار اٹھا لیے۔ وہ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی تھی۔ بے انتہا قربانیوں کے باوجود اس جنگ میں ہندوستانیوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن متحدہ عوام کی قوت مدافعت نے انگریزوں کو چونکا دیا۔ ۱۸۶۰ء میں تاج برطانیہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بے دخل کر کے حکومت ہند کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ لوٹ کھسوٹ اور ناانصافی کا دور ایک حد تک ختم ہوا اور سامراج نے چولا بدل کر ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی اختیار کی۔ اس پالیسی کے تحت انگریزوں نے ہندو مسلم نفاق کو ہوا دی اور خاص طور پر مسلمانوں کو معاشی تنگ دستی اور تعلیمی پسماندگی کے بھیانک غار میں دھکیل دیا۔ پھر بھی انگریز ایک دن بھی چین سے حکومت نہ کر سکے اور نہ اہل ہند کی آزاد اسپرٹ کا گلا گھونٹ سکے۔ آزاد اسپرٹ کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے مسلح اور آئینی جدوجہد کی شاندار مثال قائم کی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ اقتدار میں شرکت کرنے کے بجائے اپنے لیے ایک علاحدہ ملک کا مطالبہ کیا تاکہ وہاں بلا شرکت غیرے اقتدار کے مزے لوٹے۔ مسلم لیگ کی فرقہ پرست پالیسی اور صدر کانگریس پنڈت نہرو کے غیر ذمہ دارانہ رویے کے نتیجے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی فہم وبصیرت اور دوربینی کا نچوڑ ''کیبنٹ مشن پلان'' ناکام ہوا اور برصغیر دو خودمختار ملکوں میں بٹ گیا۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد مسلم لیگ کے جاگیردارانہ مزاج کے رہنما ۳۰ ملین مسلمانوں کو ۳۰۰ ملین غیر مسلموں کے غلبہ واقتدار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ہندوستان میں رہ

جانے والے مسلمانوں میں اکثریت ایسے دیہی مسلمانوں کی تھی جو تحریک آزادی کے دوران کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاسی کشمکش سے واقف ہی نہیں تھے۔ سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے شہری علاقے کے مسلمان جو تحریک آزادی کے قومی دھارے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے ان میں بھی اکثریت تقسیم ملک کی سخت مخالف تھی۔ تقسیم کے بعد سرحدوں کے دونوں طرف انسانی جانوں کا جو عظیم اتلاف ہوا اور بڑے پیانے پر ہجرت کے واقعات رونما ہوئے، اُس سے متاثر ہو کر ہندوستان (بھارت) کا اکثریتی طبقہ مسلمانوں کو تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرا کر انھیں وطن مولود کا دشمن سمجھ لیا۔

تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمان جس محرومی کا شکار ہوئے وہ اپنی جگہ ایک المیہ ہے۔ معاشی اور تعلیمی میدان میں وہ اپنے اہل وطن کے مقابل پسماندہ تھے۔ تقسیم کے بعد کی سیاسی الٹ پھیر نے انھیں بے زمینی کے کرب میں بھی مبتلا کر دیا۔ علمی، صنعتی اور تنظیمی صلاحیت رکھنے والے افراد جناح صاحب کی للکار پر کچھ تو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اور کچھ نئے ملک کی تعمیر کے جذبے پر اپنا گھر بار اور اپنے پسماندہ بھائی بندوں کو چھوڑ کر ایک آشوب سے دوسرے آشوب کی طرف کشاں کشاں کھینچ کر چلے گئے۔ باقی ماندہ محروم اور پسماندہ قوم کو جب کہ وہ اپنی بقا اور سلامتی کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی، کہاں اتنا حوصلہ ہوتا کہ اہل وطن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی کہ ہمیں تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرا کر تم تاریخ کا مذاق اڑا رہے ہو! جب سب سو رہے تھے، آزادی اور غلامی کے فرق کو محسوس کیے بغیر سامراجی نظام سیاست اور نظم و نسق کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے، ہم نے آواز دی تھی کہ آؤ برصغیر کی حریت اور حرمت کی حفاظت کے لیے تلوار اُٹھالو یا قلم اُٹھالو اور ہمارا ساتھ دو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اہلِ وطن جنگ آزادی کی تاریخ کے اس روشن پہلو سے ناواقفیت کی بنا پر تعصب، تنگ نظری اور غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس احساس نے اور عزیز دوست ڈاکٹر عابداللہ غازی کی تحریک نے ہمیں اس کتاب کے لکھنے پر اُکسایا۔

اس کتاب کا مسودہ تقریباً ۱۰ سال پہلے تیار کیا گیا تھا۔ چند ناگزیر مصروفیات اور تخلیقی کام کی وجہ سے میں اس مسودہ پر کوئی توجہ نہ دے سکا۔ اُدھر شکاگو میں منعقدہ چوتھی عالمی اردو کانفرنس میں محترمی ڈاکٹر خلیق انجم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف کے ذریعہ پتہ چلا کہ ہندوستان میں پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ ویں سالگرہ منائی جارہی ہے اور نومبر ۲۰۰۷ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام تین روزہ سیمینار منعقد ہونے جارہا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے نہایت خلوص اور محبت کے ساتھ فرمایا کہ سیمینار کے موقعے پر اس مسودہ کو شائع کیا جاسکتا ہے۔ سو ڈاکٹر صاحب کی خاص توجہ کی وجہ سے پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ۱۵۰ ویں جشن سالگرہ کی تقریبات کے موقعے پر یہ

کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ اس کتاب کو شائع کرنے کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے جس خلوص اور دل چسپی کا ثبوت دیا ہے میں اس کے لیے ان کا بے حد ممنون ہوں۔

یہ کتاب جنگ آزادی ہند کا ایک مختصر مگر جامع مرقع ہے۔ ہماری جوان نسل اور خاص طور پر شمالی امریکہ کے تارکین وطن کے لیے ایک تحفہ ہے تاکہ وہ اس آئینہ میں اپنے اسلاف کے کارناموں کا مشاہدہ کر لیں۔ ہمارے اسلاف نے وطن اور مذہب کی خاطر جو قربانیاں دی ہیں ہماری تاریخ کے روشن پہلو ہیں اور ان پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ اس کتاب کی نوعیت نہ تحقیقی ہے اور نہ تخلیقی۔ تاریخ کی تنقیح یا جانچ بھی ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ہم نے صرف یہ کیا ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں جو معلومات بکھری پڑی تھیں انھیں یکجا کر کے اور نئے سرے سے سلسلہ وار ترتیب دے کر کتاب مرتب کی ہے۔

پہلے دو ابواب میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور مسلم دور حکومت کا مختصر بیان ہے۔ تیسرا باب ہم نے خاص طور پر اس کتاب میں شامل کیا ہے کہ ہماری تاریخ بین المذاہب رواداری اور فرقہ وارانہ یک جہتی کی عظیم روایات کی تاریخ رہی ہے۔ لہذا ہندو مسلم تعلقات کا بیان وقت کی ضرورت اور قابل توجہ ہے۔ چوتھے اور پانچویں باب میں ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت کا ذکر خیر ہے۔ چھٹے باب میں پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ساتواں باب جنگ آزادی میں ہندوستانی علما کی شرکت اور ان کے عملی اقدامات کا مرقع ہے۔ اس باب کو ہم نے بہت مختصر رکھا ہے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ نمبرایک کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے فرمایا تھا کہ کتاب کی ضخامت ۱۲۵ صفحات سے زیادہ نہ ہونی چاہیے اور دوسرے یہ کہ علما کا رول جنگ آزادی سے لے کر تحریک آزادی تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم نے صرف جنگ آزادی کے پہلو کا احاطہ کیا ہے۔ تحریک آزادی کا بیان اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اس کتاب کے دوسرے اڈیشن کے وقت تحریک آزادی کو بھی شامل کر کے اسے حصول آزادی کا ایک مکمل تاریخی بیانیہ بنا سکتے ہیں۔ تحریک آزادی کا ابتدائی دور خاص طور پر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۰ء تک ہندو مسلم اتحاد کا درخشندہ دور تھا۔ تحریک پاکستان نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی میں رخنے پیدا کر دیے۔ فرقہ وارانہ یک جہتی کو برقرار رکھنے اور مادر وطن کو دولخت ہونے سے بچانے کے لیے گاندھی جی کی خدمات سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ گاندھی جی کے ساتھ مولانا آزاد کا نام بھی اتنا ہی تابندہ ہے۔

مولانا آزاد ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک کانگریس کے صدر رہے۔ سات سالہ صدارتی دور میں مولانا

نے قومی اور بین الاقوامی حالات کی روشنی میں کانگریس کی پالیسی مدون کی۔ تحریک آزادی کے کارواں کو اپنی علمی اور سیاسی بصیرت کے سہارے اور گاندھی جی کے اعتماد کی بنیاد پر غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکال کر آزادی کی منزل کے قریب کردیا۔ برصغیر کی سالمیت کو بچانے کے لیے آخری لمحے تک ہندو فرقہ پرستوں، مسلم فرقہ پرستوں، جاہ طلب لیڈروں اور انگریزوں کی شاطرانہ ذہنیت سے لڑتے رہے۔ اس کے باوجود جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ملک دولخت ہو چکا تھا۔ گاندھی اور آزاد جیسے عبقری لیڈروں، ہزاروں لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یہ ایک المیہ بھی تھا اور چبھتا ہوا سوال بھی۔ سوال یہ کہ اُس دور کی تاریخ نے جو قلابازی کھائی ہے اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے۔

اور آج بھی یہی سوال ہمارے سامنے ہے۔ ماضی کے تجزیے سے ہمیں سبق لینا ہے۔ جو ٹھوکریں ہمارے رہنماؤں نے کھائی ہیں چاہے وہ دانستہ ہوں یا نادانستہ انھیں اُسی دور کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ جو کچھ اب ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ برصغیر دو نہیں تین ملکوں میں بٹ گیا ہے۔ ان تینوں ملکوں میں وہی لوگ رہتے ہیں جو کبھی ایک ملک میں رہتے تھے۔ زمین اگر زلزلے سے پھٹ جائے تو دراز کے اِدھر اور دراز کے اُدھر والے کیا ضروری ہے کہ ایک دوسرے کو دشمن کی نظر سے دیکھنے لگ جائیں۔ ہمارا ملک ایک تھا۔ ہمارا کلچر بڑی حد تک ایک تھا۔ ہم تمدنی رشتے میں ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے۔ ہماری سیاسی تاریخ کٹی پھٹی تھی۔ لیکن ہماری معاشرتی اور تمدنی تاریخ جس روشنائی سے لکھی گئی تھی وہ بہت روشن اور جاذب نظر تھی۔ ہمارے صوفی، سنت اور سادھو ایک دوسرے کو سمجھنے لگے تھے۔ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے تھے۔ بسا اوقات ایک ہی چٹائی پر بیٹھ کر کھانے لگے تھے۔ ہماری بیشتر زبانیں ایک ہی ماں کی گود کھلائی بہنیں تھیں۔ جب ۱۹۴۷ء آیا تو نا فرجام سیاست نے زمین پر ایک لکیر کھینچ دی۔ جب ۱۹۷۱ء آیا تو اُسی سیاست نے ایک اور لکیر کھینچ دی۔ ماضی کی بے مروت اور نا فرجام سیاسی بازیگری سے متاثر ہو کر ہمیں اتنا بے لگام نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ان لکیروں کو ہی مٹانے کا جتن کرنے لگیں۔ کیوں کہ اب یہ سیاسی لکیریں قومی افتخار کی علامت بن چکی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ انقلابات یکے بعد دیگرے زلزلے بن کر اس زمین ہی کو نہ ہڑپ کرلیں۔ آیئے ہم ان لکیروں کے اِدھر اور ان لکیروں کے اُدھر بقائے نسل اور عظمت انسان کے لیے کام کرنے کا عہد کریں۔

تاریخ اور خصوصاً جنگ آزادی کے چیدہ چیدہ واقعات اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس امید پر بیان کیے گئے ہیں کہ ہم ان سے واقف ہو جائیں۔ ان کی روشنی میں ہمیں اپنے حال کو سنوارنا اور مستقبل کو بنانا ہے۔ ہمیں اپنے حال کو بگاڑنا اور مستقبل کو تاریک کرنا نہیں ہے۔ آزادی

حاصل کرنے سے پہلے اور بعد میں بھی ہمارے پرکھوں نے برصغیر کی سرزمین کو اپنے خون سے لالہ زار کر دیا تھا۔ اس لیے کر دیا تھا کہ ان کی آنے والی نسلیں خوف زدہ ہو جائیں، اتنی خوف زدہ ہو جائیں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خون بہانے سے توبہ کر لیں۔

اس کتاب کی تیاری میں ڈاکٹر عابد اللہ غازی کے مشورے اور مدد شامل حال نہ ہوتی تو امریکہ میں بیٹھ کر اس نوعیت کی کتاب لکھنا نہایت صبر آزما کام ہوتا۔ خصوصاً حوالہ جات والے کتب کی فراہمی کے لیے پتہ نہیں کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی۔ ڈاکٹر غازی نے اقرا ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کی لائبریری سے مطلوبہ کتب فراہم کر کے میرے کام کو آسان کر دیا۔ اگر شکریہ سے بہتر کوئی اور لفظ ہوتا تو میں یقیناً اس لفظ کا سہارا لیتا۔ لہٰذا کسی اور موزوں لفظ کی غیر موجودگی کے باعث میں صرف شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں۔

اس کتاب کا حرفِ آغاز محترمی ڈاکٹر خلیق انجم کی تاریخی فہم و بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب کی اس عالمانہ تحریر سے کتاب کی معنوی جہت میں اضافہ ہوا ہے اور اس کی پذیرائی میں یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

میری شریکِ حیات بلقیس فاروقی ہمیشہ نہایت صبر و تحمل سے تحقیقی اور تصنیفی مصروفیات کو برداشت کرتی رہتی ہیں۔ انھیں خاندانی یا ذاتی ضرورت کے کسی کام کے لیے میرا وقت درکار ہو تب بھی وہ مجھ پر دباؤ نہیں ڈالتی ہیں کہ میں لکھنے پڑھنے کے کام کو ملتوی کر کے پہلے ان کی ضرورت پوری کروں۔ شریکِ حیات کی یہ سمجھ بوجھ ایک تحقیق کار کے لیے بہت قیمتی سرمایہ ہے۔

تمت بالخیر سے پہلے محترمی ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے۔ یہ کتاب شاید شائع نہ ہوتی اگر ڈاکٹر صاحب دستِ تعاون نہ بڑھاتے۔

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی

۲ر فروری ۲۰۰۸ء

۲۵۷۲ نارتھ میلارڈ لین

راؤنڈ لیک بیچ۔ الینوائے ۶۰۰۷۳

2572, N. Mallard Ln

Round Lake Beach, IL 60073

USA

Phone: 847-245-7488

پہلا باب:

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

۱- پس منظر

۲- عہد قدیم: سماجی منظر نامہ

۳- بدھ مت کا فروغ

۴- چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی: سیاسی پس منظر

۵- بدھ مت اور جین مت: جنوبی ہند میں

۶- اسلام کا داخلہ جنوبی ہند میں

۷- مسلمانوں کا داخلہ سندھ اور شمالی ہند میں

۸- حوالہ جات

پس منظر:

اسلام انسان کی تمدنی زندگی کی شیرازہ بندی کے لیے عظمت آدم اور انسانی مساوات پر مشتمل سماجی عدل و انصاف کا ایک انقلابی نظام پیش کرتا ہے۔ اس نظام فکر کی بنیاد پر آج سے ۱۴ سو سال پہلے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں دنیا کی پہلی دستوری حکومت قائم ہوئی۔ حکومت کی تشکیل سے پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین، انصار اور مدینہ کی ساری غیر مسلم رعایا کو جن میں یہود کے تقریباً سارے قبائل شامل تھے، ایک تحریری معاہدے کے ذریعہ، ریاست کے فرائض اور شہریوں کے حقوق کا منشور (چارٹر) عطا کیا۔[1] اس منشور کو میثاق مدینہ کہا جاتا ہے۔ میثاق مدینہ میں ہر فرد اور گروہ کو مذہبی آزادی اور جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی گئی۔ اس دور کے قبائلی تمدن کے مقابلے میں میثاق مدینہ ایک ایسا انقلابی اقدام تھا جس سے عرب میں سیاسی اور معاشرتی ارتقا کا دروازہ کھل گیا۔ مدینہ کی فلاحی ریاست کی تشکیل کے ۲۵،۳۰ سال کے اندر اسلامی نظام سیاست اور سماجی عدل و انصاف کا نظام عمل جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر مغرب میں مصر تک اور مشرق میں ہندوکش کے دامن تک پھیل گیا۔ اسلامی نظام سیاست نے انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق عطا کیے۔ جان و مال کا تحفظ، سماجی عدل و انصاف، اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی، عقیدے اور مذہبی آزادی اور انسانی مساوات اس کے بنیادی اجزا تھے۔ یہ حقوق اسلامی ریاست کی تمام رعایا کو دیے گئے۔ غیر مسلموں کو بھی یہ حقوق حاصل تھے۔

خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے زمانے (۶۳۶ تا ۶۴۵ء) ہی میں اسلام کا پیغام عرب تاجروں کے ذریعہ ہندوستان پہنچ گیا۔ عرب تاجر، تجارتی اغراض سے دریائے سندھ کے ڈیلٹا سے لنکا (اس زمانے کا نام سراندیب) تک، ہندوستان کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کیا کرتے تھے۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان کے تاجروں سے عربوں کے دوستانہ تعلقات تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد عربوں کی ذہنی کایا پلٹ ہوگئی تھی۔ ہندوستانیوں نے مسلمان عربوں اور بت پرست عربوں میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ جب انھیں پتہ چلا کہ یہ تبدیلی ایک نئے مذہب کی بنا پر آئی ہے تو ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں اسلام کے تعلق سے معلومات حاصل کرنے کی جستجو شروع ہوئی۔ ساتویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستان اور خاص طور پر جنوبی ہند اور کیرالا کے علاقوں میں نئے مذہب کی قبولیت کے لیے ماحول بڑا ہی سازگار تھا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں عہد قدیم کے ہندوستان کے سماجی حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہوگی۔

عہد قدیم: سماجی منظر نامہ:

آریاؤں نے ہندوستان پر مکمل تسلط حاصل کرنے کے بعد سماج کو اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں میں تقسیم کر کے ہر ذات کے فرائض اور حقوق مقرر کر دیے تھے۔ برہمن کو مذہب اور علم کا مختار کل تسلیم کر کے سب سے اعلیٰ ذات قرار دیا گیا۔ کشتری کو زمین کی بادشاہت دی گئی اور برہمن کو ان کا سرپرست بنایا گیا۔ ویش کو تجارتی کاروبار اور لین دین کی ذمہ داری سونپی گئی اور شودر کو اچھوت مان کر سب سے ادنیٰ ذات قرار دیا گیا اور اسے اعلیٰ ذاتوں کی خدمت گزاری کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ذاتوں کی تقسیم اول اول تمدنی ضرورت کے تحت عمل میں لائی گئی تاکہ اجتماعی زندگی کے سارے پیشوں کو بروئے کار لانے والے ذمہ دار افراد کا گروہ تیار ہو جائے۔ پیشے کی بنیاد پر انسانوں کی درجہ بندی میں بظاہر کوئی قباحت نہیں نظر آتی لیکن آریاؤں نے اس درجہ بندی کو پیشے کی حد تک نہیں رہنے دیا بلکہ اسے مذہبی رنگ دے کر دھرم کا اٹل اصول بنا دیا۔ ادنیٰ ذاتوں کے افراد خاص طور پر اچھوتوں کو علم اور دولت حاصل کرنے کے حق سے اور زمین کی ملکیت سے محروم کر دیا گیا[1]۔ چناں چہ منوسمرتی میں واضح طور پر اعلان کیا گیا کہ اگر اچھوت دولت جمع کرے تو برہمن اچھوت سے وہ دولت چھین لے۔ رگ وید منوسمرتی سے ایک قدم آگے جاتا ہے اور برہمن کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اچھوت سے نہ صرف دولت چھین لے بلکہ اُسے قتل کر دے۔[2] اس سماجی جبر مسلسل کے بڑے بھیانک نتائج نکلے۔ ہندوستان کے سواد اعظم کی معاشرتی، معاشی اور مذہبی زندگی ذلت اور پسماندگی کا شکار ہو گئی۔ مزدور اور کسان طبقے کو زرعی پیداوار بڑھانے اور ترقی دینے سے کوئی دل چسپی باقی نہ رہی۔ مختلف ضروریات زندگی پیدا کرنے والے کاریگر اور صنعت کار، صنعتی ترقی سے لاتعلق ہو گئے۔ اس طرح بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کا تمدنی ارتقا نہ صرف رک گیا بلکہ آہستہ آہستہ پستی کی طرف مائل ہو گیا۔

چوتھی صدی قبل مسیح میں بدھ مت اور جین مت، ہندوستان کے پس ماندہ اور پچھڑے ہوئے طبقات کی زبوں حالی کے خلاف بطور احتجاج وجود میں آئے۔ گوتم بدھ نے برہمن کی مذہبی اجارہ داری کشتری کے سیاسی اقتدار کو چیلنج نہیں کیا اور نہ کوئی مذہبی تحریک چلائی۔ چناں چہ بدھ مت میں خدا یا بھگوان اور اس کی ذات وصفات کے بارے میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ اس کے برعکس گوتم بدھ اور مہاویر دونوں نے پسماندہ اور اچھوتوں کی فلاح و بہبود کا پرچار کرتے ہوئے ان کی معاشرتی اور معاشی غلامی کو سماج کا بدترین اصول قرار دیا لیکن ان طبقات کو زنجیر غلامی سے چھٹکارا دلانے کے لیے کوئی عملی پروگرام نہیں پیش کیا۔

بدھ مت کا فروغ:

ہندوستان کے پس ماندہ اور اچھوت ذاتوں نے بدھ مت کو ایک نعمت سمجھ کر قبول کرلیا۔ تبدیلی مذہب کے ساتھ ہی ان طبقات کی سماجی حیثیت میں بھی تبدیلی آئی۔ انھیں منوسمرتی کے غیرانسانی قوانین اور برہمن کے تسلط سے چھٹکارا ملا۔ نتیجے میں کسان، صنعت کار اور مزدور ملک کی تمدنی ترقی کی طرف مائل ہوئے۔ چناں چہ جن علاقوں میں بدھ مت پھیلا، وہاں خوش حال زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ گوتم بدھ نے سنسکرت کے بجائے پالی زبان استعمال کی، اس لیے بدھ مت کی اولین تعلیمات پالی زبان میں تحریر کی گئیں۔ برہمنوں نے سنسکرت پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ اپنی ذات کے علاوہ دوسری ذاتوں پر علم کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ پالی زبان کے توسط سے بدھ تعلیمات بہت جلد عوام تک پہنچ گئیں۔ اشوک کی تخت نشینی (۲۷۳ قبل مسیح) سے کنشک کے دور حکومت (۱۲۰ء) تک تقریباً ۴۰۰ سال کے عرصے میں بدھ مت نے غیر معمولی ترقی کی۔ مغربی ایشیا اور افغانستان سے بنگال اور برما تک، شمال میں چین سے بندھیاچل کے جنوبی حصہ تک پھیل گیا۔[۳]

بدھ مت اور جین مت کے فروغ سے جو انقلاب ہندوستان میں برپا ہو رہا تھا وہ برہمنی برتری کے لیے سخت خطرے کا باعث تھا۔ اس کایا پلٹ کے نتائج سماج میں ظاہر ہونا شروع ہوئے تو برہمنوں نے نئے مذاہب کی بیخ کنی کی تیاری شروع کردی۔ ابتدا میں برہمنوں نے نئے مذاہب میں برہمنی عقائد داخل کرنے کی غرض سے ان کی صفوں میں نفوذ کرنا شروع کیا۔ بیسیوں برہمن عالم بدھ مت اختیار کرکے اپنے علم کے زور پر رہنمائی کے مقام پر فائز ہوگئے۔ راجہ کنشک کے زمانے میں چوتھی سو سالہ بدھ کونسل ایک برہمن عالم واسومترا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس کونسل میں بدھ تعلیمات کو پالی زبان کے بجائے سنسکرت میں لکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ واسومترا (Vasumithra) نے گوتم بدھ کو بھگوان کے روپ میں پیش کرکے ان کی مورتی پوجا کی تجویز رکھی۔ جو عالم گوتم بدھ کی اصلاحی تحریک کی روح کو سمجھ چکے تھے، انھوں نے کونسل کے صدر کی تجویز کو رد کردیا اور وہ طبقہ جو برہمن پروپیگنڈے سے متاثر ہو چکا تھا مورتی پوجا کا حامی ہوگیا۔ یوں بدھ مت کی خالص سماجی اصلاح کی تحریک دو طبقوں میں بٹ گئی۔ مورتی پوجا کو رد کرنے والے طبقے کو ہنایانہ (Hinayana) اور مورتی پوجا کی حمایت کرنے والے طبقے کو مہایانہ (Mahayana) کے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ بدھ مت کے خالص سماجی اصلاح کے فلسفے میں ہندوازم کے فلسفے کو داخل کرنے اور اسے اندر سے کھوکھلا کرنے کا عمل سنسکرت کے عالموں اور برہمنوں نے ۵۰۰ء تک جاری رکھا۔

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی: سیاسی پس منظر:

۵۰۰ تا ۸۰۰ ء، کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ کا نہایت پُرآشوب زمانہ تھا۔ ہُن قبائل کے حملوں سے ۳ سو سالہ گپت خاندان کی عظیم الشان حکومت ختم ہوئی۔ برہمنوں کی تحریک پر کشتری رجواڑوں نے بدھ مت کے خلاف تلوار اُٹھائی اور قتل و خون کا بازار گرم کر دیا۔ ہزاروں، لاکھوں بدھ مت اور جین مت کے ماننے والے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ سیکڑوں بدھشٹ عالم قتل کر دیے گئے اور جو بچ گئے، وہ جنوبی ہند کی طرف ہجرت کر گئے۔[۳]

گپتا دور ہندوانڈیا یا کشتری راج کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ ۵۸۰ ء کے لگ بھگ گپتا دور کے خاتمہ کے ساتھ کشتری حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اگر چہ کہ ہرش وردھن نے ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد ڈالی لیکن ہرش کا دور حکومت (۶۰۶ء تا ۶۴۷ء) بہت مختصر رہا۔ چناں چہ کشتری حکمرانوں کا سیاسی اور عسکری زوال جو چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں شروع ہوا وہ ہرش وردھن کے انتقال کے بعد مکمل ہو گیا اور عملاً ہندوستان میں آریائی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ ہُن قبائل کا جنگجو طبقہ جو راجپوتانہ میں بس گیا تھا کشتریوں کے زوال سے فائدہ اُٹھا کر اقتدار حاصل کرنے کے لیے میدان میں کود پڑا۔ جنگ و جدل کے اس ماحول سے برہمنوں نے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے راجپوتوں کی پیٹھ ٹھونکی اور انھیں بدھ مت اور جین مت کا قلع قمع کرنے کے لیے تیار کیا۔ برہمن راجپوت اتحاد سے ہندوستان کا نیا سیاسی نقشہ تیار ہوا۔ شمالی ہند میں راجپوتوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں۔ شمالی اور وسط ہند سے بدھ مت اور جین مت کا اخراج قریب قریب مکمل ہو گیا۔ راجپوتوں کی ان خدمات کے صلے میں برہمنوں نے انھیں آریائی کشتریوں کا قائم مقام تسلیم کر لیا۔ اصلی کشتریوں سے ممیز کرنے کی خاطر راجپوتوں کے لیے اگنی کلا کشتری Agnikul Kashtriya کی اصطلاح ایجاد کی گئی۔ چناں چہ راجپوت آریائی کشتری نہیں، اگنی کلا کشتری ہیں۔[۴]

بدھ مت اور جین مت جنوبی ہند میں

اشوک کے زمانے میں بدھ مت اور جین مت دونوں جنوبی ہند میں پہنچ چکے تھے۔ ان مذاہب کے ماننے والے جنوب میں نسبتاً امن اور چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ جب شمالی ہند کے قتل عام سے بچے ہوئے بدھشٹ اور جینی ہجرت کر کے جنوبی ہند پہنچے تو یہاں کی معاشرتی زندگی میں نہایت

خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی۔ ۱۰۰ سال کے اندر اندر بدھ مت اور جین مت جنوبی ہند کے غالب مذہب بن گئے۔ بدھ مت اور جین مت کے عالم، فن کار، صناع اور ادیب مقامی لوگوں سے مل کر جنوب کی مذہبی، تمدنی، ادبی اور سماجی زندگی کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ خاص طور پر تامل ناڈو کی ثقافتی زندگی اور ادب کے ارتقا میں جین مت کے عالموں اور فن کاروں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ کیرالا، مغربی گھاٹ کے پہاڑی سلسلوں اور مرہٹواڑہ اور آندھرا کے علاقوں میں دونوں مذاہب کے آثار اور فن تعمیر کے نمونے آج بھی ملتے ہیں۔ اورنگ آباد کے آس پاس ایلورہ اور اجنتا کے غاروں میں عجوبۂ روزگار پینٹنگ اور مجسمہ سازی کا کام انجام دینے والے وہ فن کار تھے جو شمال سے ہجرت کر کے جنوب کے پہاڑی علاقوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔

جنوبی ہند کی آبادی میں دراوڑ قوموں کی کثرت تھی۔ یہاں ذات پات کی بندشوں میں شمالی ہند جیسی شدت بھی نہیں تھی۔ دراصل دراوڑ قوموں کی کثرت کی وجہ سے جنوب میں برہمنی اثرات گنتی کے چند مخصوص مقامات تک محدود تھے۔ بدھ مت اور جین مت کے پیروکار بڑی تعداد میں یہاں پہنچ گئے اور مقامی آبادی کی بہت بڑی تعداد نے بھی ان مذاہب کو قبول کر لیا تو شمال کے برہمن پھر ایک بار چوکنا ہو گئے۔ چناں چہ آٹھویں صدی کی ابتدا سے شمال کے برہمنوں نے جنوب کی طرف یلغار کرنا شروع کر دیا۔

جنوبی ہند میں بدھ مت اور جین مت کو ختم کرنے کے لیے شمالی ہند کے برہمنوں نے ۷۰۰ء سے ۱۱۰۰ء کے دوران بے شمار مہمات روانہ کیں۔ ان ۳، ۴ صدیوں میں دکن یکے بعد دیگرے چالوکیہ (Chalukya) پلّوا (Pallavas) پانڈیا (Pandyas) اور چھولا (Cholas) خاندانوں کے زیرِ نگیں رہا۔[۵] یہ سارے برہمن خاندان تھے۔ ان خاندانوں کے اکثر حکمرانوں نے شمال کے برہمن مہمات کی ہر طرح سے مدد کی۔ اس حکمتِ عملی سے شمال کے برہمنوں نے بدھ مت اور جین مت کو جنوبی ہند میں ختم کر دیا۔[۶]

اسلام کا داخلہ جنوبی ہند میں:

عہدِ قدیم سے لے کر عہدِ وسطیٰ کا سورج طلوع ہونے تک ہندوستان کی تاریخ میں ایسے پر آشوب دور کی اس کے علاوہ کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ نفرت اور سماجی جبر و تعدی کے شعلوں میں گھری ہوئی روحِ ہند شاید فریاد کناں رہی ہوگی تب ہی تو انسانی مساوات کے پیغامبر چل کر اس کے دروازے تک پہنچ گئے۔ یہ پیغام بردار جو عرب تاجر تھے ہندوستان کے لیے کوئی اجنبی اور غیر لوگ نہیں تھے۔

آج کے ہندوستانی ادب میں مسلمان عربوں کے لیے "اونٹ والے" اور آریاؤں کے لیے "رتھ والے" مجازی نام بطور ثقافتی علامت کے استعمال ہو رہے ہیں۔

مسلم ثقافت کا مزاج ابتدا سے اخوت، انسانی مساوات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترویج رہا ہے۔ لہٰذا یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے کہ "اونٹ والے" شمشیر برہنہ لے کر ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ عرب سیاح اور تاجر جن علاقوں میں عارضی قیام کرتے اسلام کا پیغام خود بخود وہاں پہنچ جاتا۔ مسلم ثقافت نے دریائے سندھ کے ڈیلٹا سے لے کر ہندوستان کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ جزیرہ سراندیب (موجودہ نام سری لنکا) تک اور اس کے جنوب میں خط استوا کے ساتھ ساتھ جزائر فلپائن، انڈونیشیا اور ملیشیا تک انسانوں کے انداز فکر اور رہن سہن میں ہمہ گیر تبدیلی پیدا کر دی۔

ماقبل اسلام کے عرب کلچر اور ہندوستان کے کلچر میں بڑی مماثلت تھی۔ دونوں امراء اور رؤسا کے کلچر تھے جس میں کم حیثیت کے انسانوں کے لیے کوئی مراعات نہیں تھیں۔ آریاؤں کی بڑی ذاتیں خاص طور پر کشتریوں میں شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کو زندہ جلا دینے کا رواج تھا۔ تناسخ کا فلسفہ کہتا تھا کہ مرنے والا شوہر دوبارہ جنم لے گا اور دوسرے جنم میں وہ اپنی پہلے جنم والی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے پہلو میں دیکھ لیتا تو آریائی غیرت اور حمیت ایسے منظر کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا آریاؤں نے طلاق کو قطعی ممنوع قرار دیا اور شوہر کے مرنے پر بیوی کو زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیا تھا۔ قبل اسلام کے عربوں میں غیرت و حمیت کا کچھ ایسا ہی غیر فطری تصور تھا۔ بیٹی جوان ہو کر شادی کے بعد اپنی جنسی ضرورت کو پوری کرے، اس عمل کو عربوں کی غیرت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چناں چہ وہ چھوٹی عمر میں اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ جب مسلمان عربوں نے ہندوستانیوں کو بتایا کہ خدا اور خدا کے آخری نبی نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے سے منع کر دیا ہے اور عورت کو سماج میں مرد کے برابر حقوق اور مقام دیا ہے تو ہندوستانیوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ عربوں نے جب یہ بھی بتایا کہ وہ ۳۶۰ بتوں کو پوجنا چھوڑ کر صرف ذات واحد کی پرستش کر رہے ہیں اور رنگ، نسل، قبیلے اور خاندانی افتخار اور بڑائی کی بنیاد پر انسانوں کو اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں میں تقسیم کے عمل کو ترک کر چکے ہیں تو ہندوستان میں ذات پات کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی اچھوت ذاتیں اور برہمنوں کے ہاتھوں ستائی ہوئی غیر ہندو مذہبی اقلیتیں نئے مذہب کی طرف راغب ہوئیں۔

عرب تاجر ہندوستان کے کسی بھی علاقے میں مستقل قیام نہیں کرتے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے ساحلی علاقوں کے لوگوں کو نئے مذہب کے بارے میں معلومات فراہم کر کے اور چند ایک ماہ قیام کر کے ان علاقوں سے کوچ کر جاتے تھے۔ لہٰذا وہ مقامی لوگ جو اسلام قبول کر لیتے تھے ان کو اپنی

زندگی اسلامی نظامِ فکر کے مطابق ڈھالنے کا کوئی معقول انتظام میسر نہیں تھا۔ لہٰذا اسلام قبول کرنے کے بعد بھی نومسلم ہندوستانی تمدن اور کلچر کے حوالے سے ہندوستانی ہی رہا۔ یہاں تک کہ ساتویں صدی کے اواخر اور آٹھویں صدی کے دوران اُن علاقوں میں جو مسلم عبادت گاہیں (مساجد) تعمیر ہوئیں ان پر مقامی فنِ تعمیر کی چھاپ نہایت واضح ہے اور بیرونی اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ خاص طور پر مساجد کی تعمیر میں وہی تعمیری اشیا استعمال ہوئی ہیں جو بدھ اور جین مندر میں استعمال ہوا کرتی تھیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں نے ان علاقوں کی تمدنی زندگی میں انقلابی تبدیلی لانے کی کوئی جارحانہ کوشش نہیں کی۔ ان علاقوں کے لوگوں کو اسلام سے واقف کر کے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ یوں مقامی آبادی نے نومسلموں کے رہن سہن، بات چیت، کھانے پینے، یہاں تک کہ ان کی عبادت گاہوں کے عمومی ڈھانچے میں کوئی اجنبیت نہیں محسوس کی۔ ۔۔الا یہ کہ نومسلم بت پرستی ترک کر کے ایک خدا کی پرستش کرنے لگے اور ذات پات کی بندھنوں سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ لہٰذا عربوں کے لائے ہوئے مذہب کو قبول کرنے کے باوجود ہندوستانی نومسلم، مقامی لوگوں کے لیے ویسے ہی قابلِ قبول رہے جیسے تبدیلیِ مذہب سے پہلے تھے۔ یہ وہ عوامل تھے جس کی بنا پر مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان خوش گوار تعلقات کی وہ تاریخی روایات پروان چڑھیں، جن کے عملی مظاہر کو ہم گنگا جمنی تہذیب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا داخلہ سندھ اور شمالی ہند میں:

سندھ میں مسلمانوں کا داخلہ ایک علاحدہ نوعیت کا ہے۔ سندھ کی بندرگاہ دیبل کے قریب سندھ کے میدقوم کے بحری ڈاکوؤں نے سراندیپ کی طرف سے آنے والے تجارتی جہاز کو لوٹ لیا۔ اس جہاز میں ایک عرب تاجر کی بیوہ، اس کے بچے اور دوسرے افراد سفر کر رہے تھے۔ سراندیپ کے راجہ نے خلیفہ ولید بن عبد الملک سے دوستی استوار کرنے کی غرض سے تحائف روانہ کیے تھے جو اسی جہاز میں تھے۔ تجارتی جہاز کالی کٹ، تھانہ، بھروچ، کھمبایت اور سورت کی بندرگاہوں سے ہوتا ہوا سندھ کے سمندری احاطہ میں داخل ہوا۔ اُسے دیبل کی بندرگاہ تک پہنچنے سے پہلے بحری قزاقوں نے لوٹ لیا۔ عورتوں، بچوں اور حاجیوں کو قید کر لیا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب بصرہ کے گورنر حجاج بن یوسف کو ملی تو اُس نے سندھ کے راجہ داہر کے پاس سفارت روانہ کی اور عرب عورتوں، بچوں اور حاجیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ سفارت کی ناکامی سے حجاج چراغ پا ہو گیا اور سندھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس مہم کے لیے اپنے ۱۷ سالہ بھتیجے محمدؒ بن قاسم کا انتخاب کر کے دربارِ خلافت سے اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے پر محمدؒ بن قاسم کو جو اُن دنوں اپنے وقت کے بہترین سپہ سالار تھے

بن مسلم باہلی کی کمان میں ترکستان کے محاذ پر مصروف تھا، سندھ پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سندھ اُن دنوں ایک برہمن خاندان کے راجہ داہر کے زیر نگیں تھا۔ یہ ایک وسیع سلطنت تھی جو سارے شمال مغربی ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُس دور کے سندھ میں پنجاب بھی شامل تھا اور وہ شمال مشرق میں کشمیر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے مغرب میں قلات اور مکران تھے اور مشرق میں قنوج اور گجرات (کاٹھیاواڑ) کی ریاستیں تھیں۔ سندھ کی آبادی میں بدھ مت کے ماننے والوں کی اکثریت تھی لیکن حکمران برہمن اور بڑی ذات کے ہندو تھے۔

محمدؒ بن قاسم ۷۱۱ء میں ۶ ہزار شامی عرب سپاہیوں کے ساتھ شیراز سے کوچ کر کے مکران سے ہوتا ہوا بلوچستان کی پہاڑوں کو عبور کر کے سندھ میں داخل ہوا اور ۳ سال کے مختصر عرصے میں سارا سندھ فتح کر لیا۔ سندھ فتح کرنے کے لیے محمد بن قاسم کو کئی ایک چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے علاوہ دیبل، راوڑ، برہمن آباد، ارور اور ملتان کے شہر اور قلعے فتح کرنے کے لیے بڑی جنگیں لڑنی پڑیں۔ دیبل کے قلعے میں ۴۰ ہزار ہندوستانی سپاہی تھے، جس پر محمدؒ بن قاسم نے ۶ ہزار سپاہیوں کے ساتھ حملہ کیا۔ راوڑ کی جنگ راجہ داہر اور محمدؒ بن قاسم کے مابین ہوئی۔ راجہ کے پاس ۶۰ ہزار فوج اور ایک سو جنگی ہاتھی تھے۔ محمدؒ بن قاسم کی فوج کی عددی قوت اس جنگ میں ۱۵ ہزار تھی۔ اُس جنگ میں راجہ داہر کو شکست ہوئی اور وہ بہادری سے لڑتا ہوا میدان جنگ میں مارا گیا۔ برہمن آباد کی جنگ میں راجہ داہر کا بیٹا جے سنگھ ۴۰ ہزار سپاہیوں کو لے کر میدان میں آیا۔ محمدؒ بن قاسم کے پاس وہی ۱۵ ہزار سپاہی تھے۔ راجہ داہر کا دوسرا بیٹا گوپی ۴۰ ہزار سپاہیوں کو لے کر ارور میں قلعہ بند ہو گیا۔ محمدؒ بن قاسم نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ ارور پر حملہ کیا اور معمولی مزاحمت کے بعد ارور پر قبضہ کر لیا۔ سندھ کی فتح کی آخری جنگ ملتان میں ہوئی۔ وہاں راجہ داہر کے بڑے بھائی چندر کا بیٹا گورسنگھ حاکم تھا۔ ملتان کی جنگ میں محمدؒ بن قاسم کے جھنڈے تلے ۴۰ ہزار سپاہی تھے۔

۳ سال کے مختصر عرصے میں پانچ بڑی جنگوں کے باوجود محمدؒ بن قاسم کی فوج میں یہ عددی اضافہ ایک قابل توجہ واقعہ ہے۔ لیکن اکثر تاریخ نویس اسے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ سندھ کی جنگوں کے دوران حجاج بن یوسف کی طرف سے صرف ایک بار ۲ ہزار کی فوجی امداد سرزمین عرب سے روانہ کی گئی تھی۔ ۷۱۳ء میں جب نئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے حکم سے محمدؒ بن قاسم کو گرفتار کر کے سندھ سے لے جایا جا رہا تھا تو اس کی کمان میں ۵۰ ہزار سے زائد ہندوستانی سپاہی قنوج پر حملے کے لیے تیار کھڑے تھے اور راجہ داہر کی رعایا محمدؒ بن قاسم کو ایک دیوتا کے مانند پوج رہی تھی۔ تاریخ کا یہ عجوبہ ہے کہ راجہ داہر کی مقامی حکومت کو ختم کرنے والے بیرونی حملہ آور کو راجہ کی رعایا نے دیوتا کا درجہ دیا اور مقامی حکومت کو ختم کرنے کے لیے بیرونی حملہ آور کی فوج میں جوق در جوق شامل

ہو گئے۔ کیا رعایا اور مقامی فوجی سپاہیوں کے اس رویّے کا کوئی جواز ہے؟ قدیم تاریخ نویسی کی یہ خامی رہی ہے کہ مورخوں نے تاریخ کو سماج اور عوام سے الگ کر کے صرف حکمران طبقے کی رزمیہ یا بزمیہ داستان بنا دیا ہے۔ اقتدار کی تبدیلی اور حکمران خاندانوں کے عروج و زوال کے عمل کو ان کی ذاتی بہادری اور عسکری قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ سمجھ لیا گیا۔ آٹھویں صدی کے اوائل میں سندھ میں جو انقلاب آیا اس کی بنیادی وجہ کچھ اور ہے۔ مقامی آبادی کے وہ طبقے جو ذات پات کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، معاشی و معاشرتی غلامی کی ذلت آمیز زندگی گزار رہے تھے، مقامی اور بیرونی کے تصور سے نا آشنا تھے۔ ملکی یا قومی مفادات کے پیچیدہ فلسفے سے بھی واقف نہیں تھے اور زمین کے جغرافیائی خطوط کے آر پار آنے جانے کے لیے پاسپورٹ اور ویزا کی قید و بند سے آزاد تھے۔ انھوں نے اپنی سماجی بھلائی اور بہتری کے لیے وہی کیا جو انھیں کرنا چاہیے تھا۔ کیوں کہ محمدؒ بن قاسم صرف شمشیر بردار فاتحین کو لے کر نہیں آیا تھا بلکہ لشکر اسلام کے پرچم برداروں کے پھریروں سے فضا میں ایک پیغام کی گونج بھی سنائی دے رہی تھی۔ ''اللہ کے بندو بھائی بھائی بن کر رہو۔'' ؎

فوجی سرگرمیوں اور جنگ و جدل کے دوران محمدؒ بن قاسم نے جو انتظامی اور اصلاحی اقدامات کیے اس کے پیچھے وہی ذہن اور شعور تھا جو اس پیغام کو اجتماعی زندگی کی اصل بنیاد سمجھ چکا تھا۔[۵]

۱- قلعہ ارور کی فتح کے بعد راجہ داہر کے وزیر سی ساکر نے امان طلب کی اور اُن عرب عورتوں اور تمام قیدیوں کو جو سراندیپ سے آئے ہوئے تجارتی جہاز سے اُٹھا لیے گئے تھے محمد بن قاسم کی خدمت میں پیش کیا۔ محمدؒ بن قاسم نے اُسے امان دی اور اُسے اپنا وزیر مقرر کر لیا۔

۲- قلعہ بابیہ کا حاکم راجہ داہر کا چچازاد بھائی تھا۔ اُس نے محمد کی اطاعت کر لی۔ محمدؒ نے اُسے وزیر مال بنایا اور مبارک شیر کا خطاب دیا۔

۳- برہمن آباد کے شہریوں نے درخواست کی کہ شہر کا انتظام ان کے سپرد کر دیا جائے۔ محمدؒ نے شہریوں کی ایک کمیٹی بنائی اور شہر کا انتظام اس کمیٹی کے حوالے کر دیا۔ کمیٹی کے ممبروں کو رانا کا خطاب دیا۔

۴- برہمن آباد کے چار معزز تاجروں کی ایک کمیٹی بنائی گئی اور دیوانی عدالت کے انتظامات ان کی تحویل میں دیے گئے تاکہ شہریوں کے مذہب اور رسم و رواج کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔

۵- ملک میں لگان وصول کرنے کے لیے برہمن عالموں کو مقرر کیا گیا اور انھیں ہدایت کی گئی کہ رعایا پر ظلم نہ کریں اور ان کی حیثیت سے زیادہ لگان وصول نہ کیا جائے۔

۶- ایک لاکھ بیس ہزار درہم برہمن آباد اور ملتان کے اُن شہریوں کو دیے گئے جن کا مال و اسباب دوران جنگ تباہ ہو گیا تھا۔

۷- برہمن اور بدھ پجاریوں کے لیے مالگزاری یا لگان میں سے ایک مقررہ رقم ان کی امداد کے لیے مقرر کر دی گئی۔

۸- برہمن آباد میں ایک عالیشان مندر تھا جس میں بے شمار پجاری رہتے تھے۔ شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کے بعد مقامی آبادی نے خوف و دہشت سے مندر آنا بند کر دیا تھا۔ پجاریوں کو خاص طور پر ہدایت دی گئی کہ مندر کو آباد رکھنے اور اپنے آبائی مذہب پر عمل کرنے کے بارے میں کوئی ممانعت نہیں ہوگی۔

راجہ داہر کی شکست کے بہت سارے اسباب ہیں۔ ان میں شمالی ہند کے حکمران طبقے کی نااتفاقی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ عہد قدیم میں پنجاب اور سندھ بیشتر بیرونی تسلط کے زیر اثر رہے ہیں۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق اکثر اوقات دریائے سندھ تک کا علاقہ ایران کے بادشاہوں کے قبضہ میں رہا ہے۔ اس کی تصدیق ونسنٹ اسمتھ کی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا سے بھی ہوتی ہے۔ چناں چہ محمدؒ بن قاسم کے سندھ پر حملے سے آریاورت میں کوئی بڑی ہلچل نہیں پیدا ہوئی، لیکن سندھ کی سماجی زندگی پر اس حملے کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوستانی ایک ایسے نظام فکر سے واقف ہوئے جس میں انسانی مساوات کے ساتھ ساتھ ایک آدم کی اولاد ہونے کے ناطے تمام انسانوں کو زمین کی نعمتوں میں برابر کا حقدار گردانا گیا تھا۔ اس نظام فکر نے ہر طبقے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ نچلی ذات کے بے زمین شودر اور اچھوت، برہمنوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے بدھ مت اور جین مت کے پیروکار اور ہندو سماج کے پسماندہ طبقات بڑی تعداد میں نئے مذہب کی طرف مائل ہوئے۔ بڑی ذات کے ہندو اور گنے چنے حکمران خاندان کے افراد بھی نئے مذہب کی طرف مائل ہوئے۔ لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی۔ خود راجہ داہر کا لڑکا جے سنگھ جو برہمن آباد کی جنگ کے بعد کشمیر میں پناہ گزیں ہو گیا تھا، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں مسلمان ہو گیا۔ جے سنگھ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب شمال مغربی ہندوستان میں مسلم فاتحین کی جنگی سرگرمیاں تقریباً ختم ہو گئی تھیں۔

سندھ کی فتح کے ساتھ ہی شمال مغربی ہندوستان میں نئے خیالات اور نئے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ادب، حکمت، فن، صنعت و حرفت، عبادات اور ریاضت کے تعلق سے نئے اسلوب اور نئے طریقۂ کار ہندوستانی ثقافت کو متاثر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک صدی سے بھی کم عرصے میں اہل سندھ نے اپنی زبان کا رسم الخط تبدیل کر کے عربی رسم الخط اختیار کر لیا۔ محمدؒ بن قاسم

کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی اور بعد میں آنے والے مسلمان جن میں منگول، ترک، افغان اور ایران کے آریائی نسل کے لوگ شامل تھے، مقامی مسلم اور غیر مسلم آبادی کے ساتھ گھل مل گئے۔ اپنے وطن مولود کو ترک کر کے سندھ کو اپنا وطن بنالیا۔

آریہ ورت کے برہمن اور راجپوت سندھ کی انقلابی صورت حال سے بڑی حد تک لاتعلق رہے یا لاعلم رہے۔ مسلمانوں کی آمد سے سندھ اور پنجاب میں جو سیاسی اور ثقافتی انقلاب آرہا تھا، اس کی طرف سے شمالی ہند کا حکمران طبقہ مجرمانہ اغماض کا مرتکب ہوا ہے۔ اس غفلت اور جوابی کاروائی کے فقدان کی اصل وجہ یہ تھی کہ شمالی ہند کے برہمن اور راجپوت بدھ مت اور جین مت کے خلاف صف آرا تھے۔ قنوج کے حاکم کو علم تھا کہ محمدؒ بن قاسم کا حملہ اس کے علاقے پر ہونے والا ہے۔ محمدؒ بن قاسم کے رخصت ہونے کے بعد قنوج کے حاکم کو یہ سنہری موقع مل گیا تھا کہ وہ سندھ سے بیرونی حملہ آوروں کو نیست و نابود کرسکتا تھا لیکن راجپوت سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے مقامی حکمرانوں سے اور اکثر اوقات آپس ہی میں کشت وخون میں اُلجھے ہوئے تھے۔ شمالی ہند میں یہ صورت حال شہاب الدین محمدؒ غوری کے حملے (۱۱۹۲ء) تک رہی۔

مسلم حملہ آوروں کا دوسرا دور گیارھویں صدی عیسوی کا ابتدائی زمانہ ہے۔ ۱۰۰۵ء سے ۱۰۲۵ء تک محمود غزنوی نے معاشی حصول کی خاطر ہندوستان پر کوئی ۱۷ حملے کیے۔ اگرچہ کہ محمود کے حملوں کی زد میں دہلی، متھرا، قنوج، کالنجر اور سومنات تک کے علاقے رہے ہیں لیکن پنجاب اور سندھ پر ۱۱۷ء کے بعد ہی مسلم اقتدار قائم ہو چکا تھا۔ محمود نے بڑی تعداد میں اہل ہند کو اپنی فوج میں بھرتی کیا اور ہندوستانی سپاہیوں کو ایک نامی گرامی ہندو جنرل تلک (Tilak) کی ماتحتی میں رکھا۔ محمود اس فوج کو ہندوستان میں ہندو حکمرانوں اور وسط ایشیا میں مسلم حکمرانوں کے خلاف استعمال کرتا رہا۔ سومنات کی لڑائی میں تلک اور اس کے ہندوستانی سپاہیوں کی جنگی خدمات، ترک اور افغان سپاہیوں سے کسی درجہ کم نہیں تھیں۔ اہل ہند نے محمود کے حملوں کو اُسی نظر سے دیکھا جس نظر سے بن قاسم کے حملوں کو دیکھتے رہے تھے۔ محمود کی اس فوجی حکمتِ عملی کو پنڈت جواہر لال نہرو نے ڈسکوری آف انڈیا کے صفحات ۲۳۵ تا ۲۳۷ تک نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ تاریخ محمود کو دنیا کے چند بڑے فاتحین میں شامل کرتی ہے۔ محمود کی شخصیت کا دوسرا رخ بھی اتنا ہی عظیم الشان ہے۔ وہ ایک رعایا پرور، عادل بادشاہ، علم و ادب کا بہت بڑا مربی اور سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں بے شمار اہل علم و حکمت، شاعر اور ادیب جمع ہو گئے تھے۔

محمود کو ہندوستان کی زبانوں، ان کے علم و ادب اور شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کے دربار کا مشہور

فارسی زبان کا شاعر خواجہ مسعود سعد سلمان ہندی زبان کا بھی شاعر تھا۔ سلمان کے ہندی دیوان کا پتہ امیر خسروؒ کی تحریروں سے چلتا ہے۔ ہندوستان کی زبانوں کی سرپرستی کا ثبوت محمود کے سکّوں سے ملتا ہے، جن پر سنسکرت کے الفاظ کندہ کروائے گئے تھے۔ ۱۰۲۱ء میں محمود نے کالنجر کا قلعہ فتح کیا تھا۔ کالنجر کے راجہ نندا نے شاہ غزنوی کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر روانہ کیا۔ محمود راجہ نندا کے ادبی شعبہ بارے سے اتنا متاثر ہوا کہ کالنجر اور اس کے اطراف وجوانب کے ۱۴ قلعے بطور انعام اس کے حوالے کر دیے۔

ایسے ادب نواز اور وسیع القلب بادشاہ کی فوجی سرگرمیاں اور ملک ہند پر مسلسل حملے تاریخ کے طالب علم کو اُلجھن میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر ان حملوں کا مقصد ہوسِ ملک گیری تھا تو پھر محمود کو مفتوحہ علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لینے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ اگر ان حملوں کا مقصد غیر مسلم عوام کا خون بہانا تھا تو تاریخ ایسی کوئی شہادت نہیں پیش کرتی کہ محمود نے نہتے عوام کے خون سے اپنی تلوار کو آلودہ کیا ہو۔ محمود کی فوج میں ہندوستانی سپاہیوں کی موجودگی اور فوجی سالاروں کے زمرہ میں ہندو جرنیلوں کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ محمود غزنوی کے حملے کوئی مذہبی رنگ نہیں لیے ہوئے تھے۔ وہ ایک ترک حکمران کی فوجی مہمات تھیں جو ہندوستان سے دولت بٹور کر اپنی حکومت کی معاشی بنیاد کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ دولت بٹورنے کے لیے اس نے ان سارے مراکز پر حملہ کیا جہاں سے اُسے بے اندازہ دولت مل سکتی تھی۔

مسلم حملہ آوروں کا تیسرا ریلا پٹھان حکمران شہاب الدین محمد غوری کے زیر کمان ہندوستان میں داخل ہوا۔ اس وقت رائے پتھورا یا پرتھوی راج اجمیر کا طاقتور راجپوت حکمراں تھا۔ ۱۱۹۱ء میں غوری نے پنجاب کی سرحد پار کر کے مشرق کی طرف پیش قدمی کی۔ جب پرتھوی راج کو شہاب الدین کے عزائم کا علم ہوا تو شمالی ہند کے راجپوت حکمرانوں کو متحد کر کے ۲ لاکھ سپاہیوں کو لے کر پرتھوی راج اجمیر سے نکلا اور ترائین کے میدان میں شہاب الدین کے مقابل آ گیا۔ میدانِ جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں نے پٹھانوں کے دانت کھٹے کر دیے اور انھیں شکستِ فاش دی۔ ۱۱۹۲ء میں غوری نے دوسرا حملہ کیا، اُس وقت راجپوت حکمرانوں میں پھوٹ پڑ چکی تھی۔ چناں چہ پرتھوی راج نے اکیلے ہی ترائین کے میدان میں شہاب الدین کا مقابلہ کیا اور بہادری سے لڑتا ہوا میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ ترائین کی دوسری جنگ کے ساتھ ہی شمالی ہند میں عملاً راجپوت اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔

محمود غزنوی اور شہاب الدین محمد غوری کے حملوں کا تقابل کرتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو ڈسکوری آف انڈیا میں رقم طراز ہیں:

> "محمود غزنوی کے حملے یقیناً ایک غیر ہندوستانی ترک کے حملے تھے، جس کے نتیجہ میں پنجاب کچھ مدت کے لیے ہندوستان سے علاحدہ ہو گیا۔ لیکن بارھویں صدی عیسوی کے اختتام پر ہندوستان میں افغانوں کا داخلہ ایک مختلف

نوعیت کا تھا۔ افغان ہند آریائی نسل کے لوگ تھے اور باعتبار نسل ہندوستانیوں سے قریبی رشتہ میں منسلک تھے۔" (ڈسکوری آف انڈیا، صفحہ ۳۳۸)

حوالہ جات

۱- سیرت النبی کامل جلد اول، صفحہ ۵۵۳: مرتبہ ابن ہشام (ترجمہ: مولانا عبدالجلیل صدیقی اور مولانا غلام رسول مہر): مطبوعہ: اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئی والان، دہلی نمبر ۶: ۱۹۸۵ء

۲- قدیم ہندوستان میں شودر: صفحہ ۱۰۰ تا ۱۲۶: ڈاکٹر رام شرن شرما (مترجم: جمال محمد صدیقی) مطبوعہ: ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی بہ اشتراک انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی: پہلا اردو اڈیشن، ۱۹۷۹ء

3-The Destruction of Budddhism and Jainism in India: Professor K.M. Bahauddin: Publisred in Nation and the world May 1,2001: Page 45: Indian Publication LTD New Delhi. Editor Saiyid Hamid.

4 - Ibid : Page 46

5 - The Oxford History of India 4th edition ,Pages 213 and 219: Vincent A.Smith : Oxford University Press, Delhi: Fifteenth impression 1998.

6 - The Destruction Of Buddhism and Jainism In India Part 2 ,Professor K.M. Bahauddin: Published in Nation and the world May 16, 2001: Page 36: Indian Publication LTD, New Delhi: Editor: Saiyid Hamid.

۷- رسول رحمت: صفحہ ۶۹۴: مولانا ابوالکلام آزاد (مرتبہ: غلام رسول مہر): اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۸۶ء

۸- خدا بخش میموریل اینول لکچر: بی این پانڈے، مطبوعہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء

دوسرا باب:

مسلمانوں کا دورِ حکومت

۱-سلطنت دہلی ۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء

۲-سلطنت دہلی کے قیام کے اثرات

۳-ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ

۴-سلطنت دہلی کی سیاسی پالیسی

۵-مغل سلطنت ۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء

۶-مغلیہ سلطنت کا عروج اور زوال

۷-ہندوستانی ثقافت پر مغلوں کے اثرات

۸-حوالہ جات

سلطنت دہلی: ۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶ء

اجمیر پر قبضہ کرنے کے بعد شہاب الدین نے دہلی کے راجپوت حکمران جے چند کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کرلیا اور اس کے سپہ سالار بختیار خلجی نے اُسی سال بہار اور بنگال کے علاقے فتح کرلیے۔ اس طرح بہت ہی مختصر مدت میں سارے شمالی ہند پر شہاب الدین کا قبضہ ہوگیا۔ مفتوحہ علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل کرکے اور اپنے غلام قطب الدین ایبک کو نائب سلطنت مقرر کرکے شہاب الدین محمدؒ غوری افغانستان واپس چلا گیا۔ ۱۲۰۶ء میں جب شہاب الدین کا انتقال ہوگیا تو قطب الدین ایبک نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ ۱۱۹۲ء سے ۱۲۰۶ء تک شمالی ہند شہاب الدین محمد غوری کی سلطنت کے ماتحت رہا۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک کی تخت نشینی کے بعد ہندوستان میں پٹھانوں کی خودمختار حکومت قائم ہوئی جو کسی بیرونی حاکم اعلیٰ کے ماتحت نہیں تھی۔ اس سلطنت کو تاریخ میں سلطنت دہلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پنڈت نہرو کے قول کے مطابق پٹھانوں کی حکومت کو غیر ہندوستانیوں کا سیاسی اقتدار نہیں کہا جاسکتا ہے۔

ہندوستانیوں اور افغانوں کے سماجی اور سیاسی تعلقات کی تاریخ عہد قدیم سے شروع ہوتی ہے۔ مہابھارت کے ہیرو کورو بھائی گندھارا (موجودہ نام قندھار) کی شہزادی گندھاری کے بیٹے تھے۔ گندھاری کی شادی ہستنا پور کے شہزادے اور ولی عہد دھرت راشٹر سے ہوئی تھی۔ مہابھارت کی ہولناک جنگ میں کوروؤں کی طرف سے گندھارا کے شاہی خاندان کے افراد، امرا اور افغان فوجی شامل تھے۔ گندھارا کے بادشاہ کنشک کے زمانے (۱۲۰ء) میں جس کا پائے تخت پشاور (قدیم نام پرشاپور) تھا، شمالی ہند پر افغان حکومت کررہے تھے، وہی افغان جو مسلمان ہو چکے تھے شہاب الدین کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے اور راجپوتوں کو اقتدار سے محروم کرکے اپنی حکومت قائم کرلی۔ افغانوں نے یہاں کے عوام کے مذہبی، سماجی اور معاشی حقوق ویسے ہی برقرار رکھے جیسے اقتدار کی تبدیلی سے پہلے تھے۔ اس کے جواب میں ہندوستانیوں نے افغان حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کو نہ صرف تسلیم کرلیا بلکہ انھیں وہی درجہ دیا جو اس تبدیلی سے پہلے کے حکمرانوں کو حاصل تھا۔

سلطنتِ دہلی کے ۳۲۰ سالہ دور میں پانچ مختلف خاندانوں کے حکمران یکے بعد دیگرے تخت سلطنت پر بیٹھے۔ ۱۔خاندان غلاماں جس کا دور ۱۲۰۶ء میں شروع ہوا ۸۴ سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس خاندان کے اگرچہ کہ ۱۰ حکمرانوں کے نام تاریخ کے صفحات پر درج ہیں لیکن ان میں جو قابل ذکر ہیں وہ ہیں: قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء)، شمس الدین التمش (۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء)،

رضیہ سلطانہ (۱۲۳۶ء تا ۱۲۴۰ء)، ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ء تا ۱۲۶۶ء) اور غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء)۔

معز الدین کیقباد (۱۲۸۷ء تا ۱۲۹۰ء) اس خاندان کا آخری حکمران تھا۔ اس کے دور میں جب حکومت کے معاملات بگڑنے لگے تو پنجاب کے گورنر جلال الدین فیروز خلجی نے دہلی کے تخت پر قبضہ کر کے خلجی خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ء تا ۱۲۹۶ء) کے بھتیجے علاالدین خلجی نے اپنے چچا کو قتل کر کے ۱۲۹۶ء میں حکومت حاصل کی۔ علاالدین خلجی (۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء) کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ (۱۳۱۶ء تا ۱۳۲۰ء) اپنے باپ کا نااہل وارث ثابت ہوا۔ انتظام سلطنت میں جب کمزوری کے آثار پیدا ہوئے تو امرا نے مبارک شاہ کو قتل کر دیا اور ملتان اور دیپالپور کے صوبہ دار غازی ملک کو غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین کروایا۔

غیاث الدین تغلق (۱۳۲۱ء تا ۱۳۲۵ء) کے بعد اس کا بیٹا محمد تغلق تخت نشین ہوا۔ محمد تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) کے بعد اس خاندان کے پانچ بادشاہوں نے حکومت کی۔ ان میں تین قابل ذکر ہیں۔

فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء)، ناصر الدین محمود (۱۳۹۰ء تا ۱۳۹۴ء) اور محمود شاہ (۱۳۹۴ء تا ۱۴۱۳ء)۔ محمود شاہ کے دور میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا (۱۳۹۸ء)۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد شہر میں قتل عام کیا اور دہلی کو پوری طرح برباد کر کے واپس چلا گیا۔ ۱۴۱۴ء میں خضر خان نے جس کو تیمور نے پنجاب کا صوبہ دار مقرر کیا تھا، دہلی پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ حکومت سیدوں کی حکومت کہلاتی ہے۔[۲] یہ حکومت ۱۴۵۱ء تک قائم رہی۔ اس خاندان کا آخری حکمران علا الدین عالم شاہ تھا۔[۳] ۱۴۵۱ء میں ایک پٹھان سردار بہلول لودھی نے دہلی پر قبضہ کر کے لودھی خاندان کی حکومت قائم کی۔ اس خاندان کے آخری بادشاہ ابراہیم لودھی (۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء) کو بابر نے پانی پت کے میدان میں شکست دے کر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

سلطنت دہلی کے قیام کے اثرات

سلطنت دہلی کے قیام کے بعد ہندوستان میں معاشرت، تہذیب و تمدن اور علم و حکمت کے میدانوں میں تبدیلی کا دور شروع ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ علمائے طریقت اور صوفیائے کرام کے اخوت اور محبت سے لبریز انسان دوستی کے سلوک نے ہندوستان کے پسماندہ اور سماجی عزت سے محروم طبقات کو نئے مذہب کی طرف راغب کیا۔ لیکن اس تبدیلی سے ہندوستان کے قدیم شاہی خاندانوں کے افراد، امرا، تاجر، زمیندار اور اعلیٰ ذات کے مذہبی طبقوں کے مفادات پر کوئی ضرب

نہیں پڑی۔ لہٰذا ہندوؤں کے مقتدر طبقات نے پسماندہ اور خاص طور پر اچھوتوں کی مذہبی تبدیلی سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔ کیوں کہ اول تو نئے مذہب کو قبول کرنے والوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ عام آبادی میں کوئی نمایاں فرق نہیں واقع ہو رہا تھا اور دوسرے یہ کہ ہندوستانی نومسلموں کو خاص طور پر پسماندہ اور اچھوت طبقات کے نومسلموں کو مہاجر مسلم کمیونٹی نے کبھی سماجی حیثیت سے اپنے برابر نہیں سمجھا۔ مذہبی تبدیلی سے کہیں اہم اور قابل توجہ تبدیلیاں، معیشت، صنعت وحرفت، علم و حکمت اور شعر وادب کے میدانوں میں آنی شروع ہوئیں اور ایک ایسے نظام عمل کی راہیں ہموار ہوئیں جو عوام الناس کو تمدنی ترقی اور مادی خوش حالی کے مواقع فراہم کرتا تھا۔ چناں چہ سلطنت دہلی کے تین سو سالہ دور میں ہندوستان نے جو کچھ حاصل کیا اس کی فہرست بہت طویل ہے۔ اسلام بہ حیثیت مذہب کے سلطنت دہلی کے قیام سے تقریباً ۵۰۰ سال قبل ہندوستان میں داخل ہو چکا تھا۔ پنجاب، سندھ، جنوبی ہند اور مغربی ساحلی علاقوں میں اپنی جگہ بنا چکا تھا۔ نئے مذہب کی رفتار اگر چہ بہت سست تھی لیکن اسلام کے اخلاقی اقدار اور انسانی مساوات کے تصورات اپنا رنگ دکھا رہے تھے۔ سلطنت دہلی کے قیام کے بعد مسلم ثقافت اپنے علمی اور جمالیاتی رعنائیوں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی۔

تیرھویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے اسلامی تہذیب و تمدن اور علم وحکمت کے مراکز جب منگولوں کے حملوں سے تباہ و برباد ہو گئے اور وہاں کے اہل علم و ہنر جو قتل عام سے بچ نکلے، انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ عرب کے سائنسداں اور فلاسفر، ایران کے اہل زبان و ادیب، بخارا کے اہل علم، خراسان کے تاجر، چین کے مصور، ہر شہر اور ہر نسل کے دستکار، فن تعمیر کے ماہرین، یونانی علوم کے ماہر اور روم کے طبیب ہندوستان پہنچنے لگے۔ ان اہل فن مہاجرین نے ہندوستان کو مالا مال کیا۔ پناہ گزین مہاجرین کے قافلے سلطنت دہلی کے سیاسی استحکام، علمی اور سائنسی ترقی سے متاثر ہو کر ہندوستان آئے اور آکر یہاں بس گئے۔ اہل ہند نے ان مہاجرین کو نہایت فراخ دلی سے قبول کر لیا اور ان کے ساتھ مل کر ملک کی علمی اور تمدنی ترقی کے کام میں منہمک ہو گئے۔ مختلف سماجی، مذہبی اور ثقافتی اقدار کے حامل غیر ملکی افراد کی مسلسل آمد اور ملک کے اندر بس جانے کا عمل ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ اس کے باوجود ملکی اور غیر ملکی طبقات کے بیچ کسی قسم کی حریفانہ جذبات اور رویے کی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ اس کے برعکس پورے ملک میں امن وسکون کا بے مثال ماحول پروان چڑھا، اسی لیے عہد وسطیٰ کا ہندوستان اسلام کے اخلاقی اقدار اور عرب وایران کے تہذیبی عناصر کو اپنے بطن میں داخل کر کے مذہبی رواداری، علمی و سائنسی ترقی اور خوش حال معیشت کا گڑھ بن گیا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کو اس مقام پر پہنچانے میں مسلم ثقافت نے

نمایاں کردار ادا کیا۔ کیوں کہ مسلم ثقافت کا مزاج شروع ہی سے رواداری، اخوت، انسانی مساوات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کا رہا ہے۔ سلطنتِ دہلی کے حکمران مسلم ثقافت کی ان ہی روایات پر عمل کرتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں: ۴؎

''باوجود اس حقیقت کے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی پوری مدت میں ہندوستان کی حکومت کا سربراہ ایک مسلمان تھا لیکن حکومت اسلامی نہ تھی۔ ہندوستان کی ازمنۂ وسطیٰ کی حکومت کو دینی حکومت بھی کہنا غلط ہوگا کیوں کہ وہ مسلم علما کی رہنمائی میں کام نہیں کرتی تھی۔ بادشاہ کے ذاتی عقائد کا اس کی پبلک پالیسیوں (عام اصول جہاں بانی) سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تیرھویں صدی سے اور آگے تک ہندوستان کے تقریباً ہر ایک مسلم بادشاہ نے شریعت کے مطابق حکمرانی کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی اور ایسا کرنا ناممکن قرار دیا۔ التمش، بلبن، علاالدین خلجی اور محمد تغلق مغل حکمرانوں سے پہلے کے فرماں رواؤں میں ایسے تھے جنھوں نے مسلم قانون کو ہندوستان میں نافذ کرنے کی صحت پر شک ظاہر کیا ہے۔''

ڈاکٹر تاراچند پروفیسر حبیب کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں: ۵؎

''یہ صحیح ہے کہ مسلمان بادشاہ جو زیادہ تر بیرونی نسل سے تھے چھ سات صدیوں تک ہندوستان کے تخت پر بیٹھے لیکن وہ ایسا اس لیے کر سکے کہ ان کی تخت نشینی اسلامی حکومت کی تخت نشینی نہ تھی۔ اگر اس کے برخلاف ہوا ہوتا تو وہ ایک نسل تک بھی قائم نہ رہ سکتے تھے۔''

ان مباحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلم دور حکومت ابتدا ہی سے سیکولر دور رہا ہے۔ مذہب مسلم حکمرانوں کا ذاتی معاملہ تھا اور غیر مذہبی حکومت ان کا سیاسی مسلک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم حکمرانوں کی سرپرستی میں اسلام کی اشاعت کے لیے کسی بھی تبلیغی کارروائیوں کا ثبوت نہیں ملتا۔

ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ:

ہندوستان میں اسلام کی عمومی اشاعت اور تبلیغ کا کام صوفیائے کرام کا مرہونِ منت ہے۔ اچھوت

اور سماج کے پچھڑے طبقات صوفیائے کرام کے انسانی مساوات کے عملی مظاہرے سے متاثر ہو کر نئے مذہب کی طرف راغب ہوئے۔ صوفیائے کرام نے خانقاہوں میں بیٹھ کر حکومت وقت کی سرپرستی کے بغیر تبلیغ اور رشد و ہدایت کا کام انجام دیا۔ مسلم فاتحین کے داخلے سے پہلے اسلامی تصوف کے چار مشہور سلسلے، چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ ہندوستان پہنچ چکے تھے۔ ان چاروں سلسلوں میں سلسلۂ چشتیہ تبلیغی اور اصلاحی کام میں سب پر سبقت لے گیا اور ایسا عظیم الشان کام انجام دیا کہ نصف صدی کے اندر اندر بندگان خدا کی کثیر تعداد حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئی۔ سلسلۂ چشتیہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ شہاب الدین محمد غوری کی فوج کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ترائین کی پہلی جنگ میں شکست کے بعد شہاب الدین ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا لیکن خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان میں رہ گئے اور اجمیر کو انھوں نے اپنا مستقر بنالیا۔ اجمیر اس وقت پرتھوی راج چوہان کا دارالخلافہ، راجپوت طاقت اور ہندو مذہب کا بہت بڑا روحانی مرکز تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے اسی مرکز سے تبلیغ اسلام کی ابتدا کی۔ دوسرے سال شہاب الدین محمد غوری نے ترائین ہی کے میدان میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر اجمیر اور دہلی پر قبضہ کرلیا۔ سلطنت کا پایۂ تخت اجمیر سے دہلی منتقل ہو گیا۔ خواجہ اجمیریؒ نے اپنے خلیفہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو دہلی کی مرکزی خانقاہ کی ذمہ داری سونپ کر انھیں دہلی بھیج دیا اور خود اجمیر ہی میں ٹھہرے رہے۔ دہلی کی مرکزی خانقاہ سے جن نامور ہستیوں نے رشد و ہدایت کا کام جاری رکھا۔ ان کے نام یہ ہیں: حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ۔ ان حضرات کی کوششوں سے نصف صدی کے اندر اندر چشتی خانقاہیں سارے ملک میں پھیل گئیں۔ ان میں جن خانقاہوں نے وسیع پیمانہ پر تبلیغ کا کام انجام دیا۔ ان کے نام یہ ہیں۔ لکھنوتی، دولت آباد، گلبرگہ، برہان پور، زین آباد، مانڈو، احمد آباد، صفی پور، مانک پور اور سلون۔[۲]

سلطنت دہلی کی سیاسی پالیسی

سلطنت دہلی کے حکمرانوں نے سیاسی اعتبار سے سارے ہندوستان کو ایک مرکز کے تحت لانے کی کوشش نہیں کی۔ عسکری قوت کو بڑھا چڑھا کر ملک کی دولت کو جنگ وجدل میں جھونکنے کے بجائے ذرائع آمدنی اور دولت کو رعایا کی خوش حالی کے لیے استعمال کیا اور اپنی عملداری میں تیرہویں صدی سے سولھویں صدی تک سیاسی استحکام اور امن وامان برقرار رکھا۔

دہلی سلطنت کے قیام کے بعد ۱۰۰ سال کے اندر اندر بنگال (۱۳۳۸ء تا ۱۵۷۶ء)،

جونپور (۱۳۹۴ء تا ۱۵۷۳ء)، مالوہ (۱۳۹۲ء تا ۱۵۳۱ء) اور دکن (۱۳۴۷ء تا ۱۶۸۹ء) میں آزاد مسلم حکومتیں قائم ہو گئیں۔ سیاسی اعتبار سے ایک مرکز کے تحت نہ ہونے کے باوجود آزاد علاقائی ریاستوں کے حکمرانوں نے سلطنت دہلی کی سیاسی پالیسیوں کو اپنالیا اور اپنی اپنی عملداری میں مذہبی رواداری، تمدنی ترقی، مقامی زبانوں کے علم و ادب اور فنون لطیفہ کے فروغ کے لیے ویسا ہی ماحول فراہم کیا جیسا کہ سلطنت دہلی کے قلمرو میں پایا جاتا تھا۔ سلطنت دہلی کے حکمرانوں نے راجپوتانہ کی چھوٹی چھوٹی راجپوت ریاستوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ان ریاستوں کو ہڑپ کرنے کے لیے کوئی بڑی فوجی مہمات بھی روانہ نہیں کی گئیں۔ راجپوتوں نے سلطنت دہلی کی اس امن پسند پالیسی کا نہایت مثبت اثر لیا اور اپنی اپنی ریاستوں میں عام مسلمانوں کے لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کیں۔ خاص طور پر فنون لطیفہ کے ماہر مسلمان فن کاروں کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ مسلم اقتدار کے اس سیاسی مزاج نے ہندوستان کو ایک ایسا کلچر دیا جس کی یاد آتے ہی آج بھی ہندوستانیوں کو اس دور کا نعرہ "ہندو مسلم بھائی بھائی" یاد آجاتا ہے۔ دہلی سلطنت نے جس کلچر کی بنیاد رکھی اور اُسے پروان چڑھایا، مغلیہ سلطنت نے اُسے بام عروج پر پہنچا دیا۔

مغل سلطنت: ۱۵۲۶ء تا ۱۸۵۷ء

تیمور کی وفات کے بعد اس کی نسل میں کوئی ایسا باصلاحیت شخص پیدا نہیں ہوا جو تیمور کی عظیم الشان سلطنت کو بکھرنے سے بچا سکتا تھا۔ چناں چہ تیمور کے بعد وسط ایشیا میں تیموری شہزادے اور امرا نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں اور خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ انھیں میں ایک ریاست فرغانہ تھی جس کا حکمران عمر شیخ مرزا تھا۔ ہندوستان کی مغل سلطنت کا بانی بابر مرزا اسی عمر شیخ مرزا کا لڑکا تھا۔ بابر کا سلسلۂ حسب و نسب باپ کی طرف سے تیمور اور ماں کی طرف سے چنگیز خان سے ملتا ہے۔ لہٰذا بابر کی رگوں میں تیمور اور چنگیز دونوں کا خون تھا۔ ۱۴۹۴ء میں عمر شیخ مرزا کا انتقال ہوا۔ اس وقت بابر کی عمر صرف ۱۲ سال تھی۔ شدید خانہ جنگی کے حالات میں نوعمر بابر کے لیے فرغانہ کی چھوٹی سی ریاست کی حفاظت کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ چناں چہ ۱۰ سال تک بابر خود کو اور اپنی ریاست کو بچانے کے لیے ہمسایہ ریاستوں کے حکمرانوں سے جنگ و جدل میں الجھا رہا۔ وسط ایشیا کے حالات سے مایوس ہو کر بابر نے افغانستان کا رخ کیا اور ۱۵۰۴ء میں کابل فتح کرکے وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کرلی۔ اُس وقت ہندوستان میں لودھی پٹھان حکومت کر رہے تھے۔ پنجاب کی خود مختار مسلم ریاستوں اور لودھی حکمرانوں کے درمیان علاقائی تسلط کے لیے اکثر جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ ملتان کے حاکم نے بابر مرزا کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ بابر ویسے بھی

ہندوستان کے ان علاقوں پر جو تیمور فتح کر چکا تھا، اپنا حق سمجھتا تھا اور ان کو حاصل کرنے کے لیے اُس نے ہندوستان پر کئی حملے کیے تھے۔ ملتان کے حاکم کی دعوت پر بابر نے ہندوستان پر آخری حملہ کیا۔ اور ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر آگرہ اور دہلی پر قبضہ کرلیا۔ پانی پت کی پہلی جنگ میں ابراہیم لودھی کی شکست سے اقتدار پٹھانوں کے ہاتھ سے نکل کر تیموری مغل خاندان میں منتقل ہوگیا۔

اگرچہ کہ پٹھانوں نے راجپوتوں کو شکست دے کر ہندوستان کا اقتدار چھین لیا تھا لیکن سلطنت دہلی کے دور میں راجپوتانہ عملاً مختلف راجپوت خاندانوں کے تسلط ہی میں رہا۔ لودھی حکومت کے دور میں سلطنت دہلی سکڑ کر ایک علاقائی حکومت بن گئی تھی اور راجپوت دوبارہ ہندوستان کا اقتدار حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا بابر کے حملے کے وقت راجپوت ابراہیم لودھی کا ساتھ دے کر مشترکہ طاقت کے ساتھ بیرونی حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے بجائے خاموش تماشائی بنے رہے۔ کیوں کہ راجپوت سمجھتے تھے کہ بابر تیمور کی طرح لودھی حکومت کو تباہ و برباد کر کے واپس چلا جائے گا اور لودھیوں سے لڑ کر حکومت حاصل کرنے کے بجائے لودھی حکومت کے تباہ شدہ کھنڈر پر اپنی حکومت کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے لیکن بابر نے دہلی سلطنت کو ختم کر کے مغل سلطنت کی بنیاد رکھی تب راجپوتوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ دہلی کی مرکزی حکومت کا اقتدار حاصل کرنے کے لیے حرکت میں آگئے۔ چتوڑ کے راجہ رانا سانگا کی قیادت میں راجپوتوں کی متحدہ فوج نے بابر کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے لیے پیش قدمی کی۔ بہت سارے افغان سردار جو لودھی خاندان کی تباہی کے بعد بابر کے جانی دشمن ہوگئے تھے، وہ بھی راجپوتوں سے مل گئے۔ ۱۶ رمارچ ۱۵۲۷ء کو بابر نے ۱۲ ہزار کی فوج کے ساتھ کنواہہ کے مقام پر راجپوتوں اور افغانوں کی ۲ لاکھ متحدہ فوج کا مقابلہ کیا اور انھیں شکست فاش دی۔ کنواہہ کی جنگ کے بعد بہت سارے شکست خوردہ افغان سردار بنگال کے حاکم نصرت شاہ کے پاس پہنچ گئے اور نصرت شاہ کی مدد سے انھوں نے بابر سے ایک بار پھر جنگ کی۔ ۶ رمئی ۱۵۲۹ء کو بابر نے نصرت شاہ اور شکست خوردہ افغان سرداروں کی متحدہ فوج کو دریائے گھاگرا کے کنارے شکست دی۔ کنواہہ اور گھاگرا کی جنگ کے بعد مغل اقتدار کو چیلنج کرنے والا اور دہلی کی مرکزی حکومت کا کوئی دعویٰ دار باقی نہ رہا۔

مغلیہ سلطنت کا عروج اور زوال:

ہندوستان میں مغل حکومت ۳۱۵ سال تک رہی۔ پہلے ۱۸۱ سال بابر کی تخت نشینی (۱۵۲۶ء) سے لے کر اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) تک مغل سلطنت کے عروج کا زمانہ ہے۔ اگر ان ۱۸۱

سالوں میں سے ۱۵ سال جب اقتدار شیر شاہ سوری اور اس کے خاندان میں رہا (۱۵۴۰ء تا ۱۵۵۵ء) نکال دیے جائیں تو مغلیہ سلطنت کے عروج کا زمانہ ۱۶۶ سال کا ہوتا ہے۔ اس دوران نہایت عظیم صلاحیتوں کے ۶ بادشاہ مغلیہ سلطنت کو نصیب ہوئے۔ بابر (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء) ہمایوں (۱۵۳۰ء تا ۱۵۵۶ء) اکبر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء)، جہانگیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء)، شاہجہاں (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۷ء) اور اورنگ زیب (۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء)۔

۱۷۰۷ء سے ۱۷۹۹ء یعنی ۹۲ سال کا دور مغلیہ سلطنت کا عہد زوال ہے۔ اس دور میں مغلوں کی فوجی قوت آپس کی خانہ جنگی میں تباہ ہوگئی۔ انگریزوں نے بنگال اور مدراس کی طرف سے ہندوستان کی سیاست میں دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ لیکن دہلی کی مرکزی حکومت کا کوئی حقیقی دعوی دار ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ہندوستان کے سیاسی افق پر صرف مرہٹہ طاقت باقی رہ گئی تھی جسے مختلف محاذوں پر شکست دے کر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۰۳ء تک اقتدار سے بے دخل کر دیا اور مرہٹہ سردار ایک ایک کر کے کمپنی بہادر کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ مرہٹہ طاقت کو کچلنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی دہلی کی مرکزی حکومت کی دعوی دار بن کر ہندوستان کے سیاسی اُفق پر نمودار ہوئی۔ چناں چہ ۱۸۰۳ء میں جنرل لیک کی سرکردگی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجیں علی گڑھ اور آگرہ پر قبضہ کرنے کے بعد دہلی میں داخل ہوئیں تو مغل شہنشاہ شاہ عالم بے بسی کے عالم میں ایک پھٹے ہوئے شامیانے کے نیچے انگریزوں کے استقبال کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ جنرل لیک نے مغل شہنشاہ کو اپنی حفاظت میں لے کر اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور پھر برعظیم کا اقتدار اعلیٰ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ۱۷۹۹ء سے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی یعنی ۵۸ سال تک مغل اقتدار برائے نام باقی رہا۔ اس دوران ایسٹ انڈیا کمپنی نہایت حکمت سے ہندوستانی عوام کو باور کرواتی رہی کہ "خلقت خدا کی ملک شہنشاہ کا اور حکومت کمپنی بہادر کی۔" یہ نعرہ انگریزوں نے اس لیے ایجاد کیا تھا کہ ہندوستانی عوام کیا ہندو، کیا مسلمان، کی وفاداریاں مغل سلطنت سے اس درجہ مضبوطی سے وابستہ ہو چکی تھیں کہ وہ مغل حاکم کے علاوہ کسی اور کی بادشاہت کا تصور کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں نے نہ صرف اپنی عسکری برتری کو منوالیا بلکہ سیاسی برتری بھی تسلیم کروالی اور تاج برطانیہ نے کمپنی کو بے دخل کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو معزول کر کے ان پر بغاوت کا الزام لگا کر جلاوطن کر دیا۔ اب انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نعرہ کو بدل دیا اور کہنے لگے۔ "ملک خلک معظم کا اور حکم انگریزوں کا۔"

ہندوستانی ثقافت پر مغلوں کے اثرات

بشمبھر ناتھ پانڈے صاحب فرماتے ہیں "ترکوں نے آکر ہندوستان کو اس کی جڑوں تک ہلا دیا اور لوگوں کو جھنجھوڑ کر نئی امیدوں کے لیے جگا کر تیار کیا۔ اس تبدیلی نے بھارت کی سماجی بنیادوں کو ہی بدل دیا۔ آریوں کی آمد نے بھارت کی سماجی زندگی کو جس طرح جڑ سے ہلا دیا تھا۔ ترکوں کا حملہ اس سے تھوڑا ہی کم تھا لیکن طوفان کے بعد سکون لازمی ہے اور زلزلے کے بعد تعمیر ضروری ہے۔ جب دو ندیوں کا سنگم ہوتا ہے تو دونوں ندیوں کی دھارائیں گرجتی ہوئی ٹکراتی ہیں۔ لیکن فوراً ہی مل جل کر ایک دھارے میں بہنے لگ جاتی ہیں۔۔۔ اسی طرح ہندو مسلمان آپس میں ٹکرا کر محبت کے ایک انسانی سنگم میں ملے۔ دونوں مذاہب الگ الگ تھے، دونوں کے تہذیب و تمدن الگ الگ تھے۔ کلچر الگ الگ تھے لیکن آپس میں مل کر ان کے الگ الگ کلچروں نے متحدہ ہندوستانی کلچر کی شکل اختیار کر لی۔ کلچر کے اس نئے دھارے نے صنعت اور حرفت، کلا اور سائنس، ادب اور شاعری، چتر کاری، مصوری اور بت گری کے چمن کو سرسبز کر دیا۔" (فخر الدین علی احمد میموریل لکچر ۱۹۸۶ء سے اقتباس) ہندوستان میں بابر کا داخلہ ویسا ہی تھا جیسا کہ بن قابل کا یا افغانوں کا۔ بن قابل نے آریائی اقتدار (کشتری راج) کے کھنڈروں پر اپنے اقتدار کی بنیاد رکھی اور ہندوستانی بن کر ہندوستان کے چند محدود علاقوں پر حکومت کی۔ انھوں نے مذہبی یا سیاسی حوالے سے ہندو یا ہندوستانی قومیت کا کوئی تصور نہیں دیا۔ ان کے بعد مغل آئے، انھوں نے بھی افغان اقتدار کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ مغلوں نے بھی مذہبی یا سیاسی حوالے سے مسلم قومیت یا ہندوستانی قومیت کا کوئی تصور نہیں دیا۔ یہ اور بات ہے کہ مغل بادشاہ آہستہ آہستہ کر کے سارے ہندوستان کو ایک مرکز کے تحت لے آئے۔ سارے ہندوستان کا ایک مرکزی نظم و نسق کے تحت آ جانا ہندوستانیوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔ اس ملک میں جو کئی مذاہب، کئی زبانوں، کئی کلچر اور مختلف تہذیبی و تمدنی روایات کا گہوارہ تھا۔ پہلی بار ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کے اُبھرنے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ سارے ہندوستان کو ایک مرکز کے تحت لانے کے لیے اورنگ زیب نے دکن کی دو مسلم علاقائی حکومتوں کو ختم کیا اور مرہٹوں کی اُبھرتی ہوئی طاقت کو کمزور کر کے ان کے توسیعی عزائم کو محدود کر دیا تھا۔

سلاطین دہلی کے دور میں ہندوستان نے جو ترقی کی تھی وہ اُس ذہن کی مرہونِ منت تھی جو باہر سے نئے خیالات اور علم و عمل کے نئے طرز لے کر ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ یہاں کے عوام میں بیداری پیدا کر کے ملک کی ترقی میں ان کا مددگار بن گیا تھا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کا یہ امتیاز رہا ہے کہ مختلف مذاہب کا گہوارہ ہونے کے باوجود عوام کی اجتماعی زندگی مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ

تیسرا باب:

مسلم دورِ حکومت میں ہندو مسلم تعلقات

۱۔ مسلم حکمرانوں کی سیاسی پالیسی

۲۔ مسلم حکمرانوں کی معاشرتی پالیسی

۳۔ خود مختار علاقائی حکومتوں کی پالیسیاں

۴۔ حوالہ جات

۱- مسلم حکمرانوں کی سیاسی پالیسی:

مغلوں کے بارے میں بیشتر مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ مغلوں نے حکومت کے نظم ونسق کی بنیاد کسی ایک مذہب کے اصولوں پر نہیں رکھی۔ اُنھوں نے کاروبار جہاں بانی میں ایران کے بادشاہوں کی سیاسی پالیسی کو اپنایا۔ چناں چہ ڈاکٹر تاراچند صاحب لکھتے ہیں "مغل بادشاہوں کا تخیل اپنے عہد کے بارے میں ایرانی اور غیر اسلامی تھا۔"[1] یعنی مغل بادشاہوں نے نظام سلطنت کو اپنے ذاتی مذہب سے الگ رکھا۔ ہندوستان کو اسلامی ملک نہیں بنایا۔ اسلامی شریعت کو ساری رعایا پر لاگو نہیں کیا بلکہ نظم ونسق کو اُنھوں نے سارے عوام، جن میں ہر مذہب کے ماننے والے شامل تھے، کی فلاح وبہبود کی بنیاد پر استوار کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا ہے۔ لیکن مغلوں کے تعلق سے یہ کہنا کہ اُنھوں نے سیاسی پالیسی ایران کے بادشاہوں سے لی اور اپنے عہد کے بارے میں ان کا تخیل غیر اسلامی تھا صحیح نہیں ہے۔

قیصر وکسریٰ کے قلمرو میں مختلف مذاہب کو ماننے والی اقلیتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ایران میں پارسی اور رومن امپائر میں عیسائی غالب اکثریت میں تھے۔ عہد قدیم میں بدھ مت مشرق وسطیٰ میں پھیل گیا تھا لیکن ظہور اسلام سے بہت پہلے بدھ مت مشرق وسطیٰ کے ممالک سے غائب ہوگیا۔ پھر بھی بدھ مت کے پیرو ہندوستان اور چین سے نکل کر مشرق وسطیٰ میں خانہ بدوشوں کی طرح گھوما کرتے تھے لیکن ایک مذہبی جماعت کی حیثیت سے ان ممالک میں مستقل آباد نہیں ہوئے۔ رومن امپائر میں یہودی ایک مذہبی جماعت کے طور پر ضرور بستے تھے لیکن ان کی حیثیت سماج میں دوسرے درجہ کے شہری کی تھی۔ البتہ عربستان میں جہاں شخصی بادشاہت کی جگہ قبائلی نظام رائج تھا یہودی عربوں کے برابر شہری اور تمدنی حقوق رکھتے تھے۔ یثرب کے علاقے میں یہودی اپنی دولت اور جماعتی نظم وضبط کی وجہ سے عربوں پر بڑی حد تک بالادستی حاصل کرچکے تھے۔ لہٰذا قیصر وکسریٰ دونوں کے کاروبار جہاں بانی میں مختلف مذاہب، مختلف کلچر اور مختلف معاشی وتہذیبی اقدار کے حامل اقلیتوں کے شہری اور انسانی حقوق کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس دور میں جب کوئی بادشاہ اپنی مملکت کے باہر کے کسی ملک کو فتح کرلیتا تھا تو وہاں کی رعایا کو شہری اور انسانی حقوق سے محروم کردیتا تھا۔ خاص طور پر مفتوح رعایا کو زمین کی ملکیت کے حق سے محروم کرکے ان کی زمینیں فاتح فوجیوں میں تقسیم کردی جاتی تھیں۔۔۔ اکثر اوقات آبادی کے بہت بڑے حصے کو غلام بنالیا جاتا تھا۔ چناں چہ ایران کی فتح کے بعد وہاں کی زمینوں کی ملکیت کا مسئلہ خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ کے سامنے آیا۔ زمانہ کے دستور کے مطابق فوج کے سربراہوں نے مطالبہ

کیا کہ مفتوح کی زمینیں عرب فوجیوں کو جاگیر میں دی جائیں اور مقامی آبادی کو غلام بنالیا جائے۔ اس مسئلے کو حضرت عمرؓ نے کس طرح حل کیا، اس کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"حضرت عمرؓ نے قرآن کے سورۃ الحشر کی آیات ۱۰ تا ۲۸ سے یہ استدلال کیا کہ فتوحات میں آئندہ نسلوں کا بھی حق ہے۔ اگر زمینیں فاتحین میں تقسیم کردی جائیں تو آنے والی نسلوں کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا۔ ص اس استدلال کی بنا پر یہ اصول قائم ہوگیا کہ جو ممالک فتح کیے جائیں وہ فوج کی ملک نہیں بلکہ حکومت کی ملک قرار پائیں گے اور پچھلے قابضین کو ان زمینوں سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔" ؎

چناں چہ ایران کی زمینوں کو ان کے اصلی مالکوں کے قبضۂ اختیار میں باقی رکھنے کے بعد حضرت عمرؓ نے نوشیرواں کے مقرر کردہ لگان کے طریقہ کو برقرار رکھا اور جو لوگ عرصہ دراز سے زمین دار اور تعلقہ دار تھے جن کو ایرانی 'مرزبان' اور 'دہقان' کہتے تھے ان سے زمینیں نہیں چھینی گئیں۔ ان کے جو اختیارات اور حقوق تھے وہ سب بحال رکھے گئے اس کے لیے تبدیلیٔ مذہب کی کوئی شرط نہیں رکھی گئی۔ حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ قرآن کی آیات کی روشنی میں کیا تھا۔ قرآن کی اس ہدایت کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بھی تھا۔ خیبر کی فتح کے بعد وہاں کی یہودی رعایا نے درخواست کی تھی کہ وہ زراعت کے کام میں ماہر ہیں اس لیے زمین ان کے قبضہ میں رہنے دی جائے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی درخواست منظور کرلی تھی اور لگان کے طور پر پیداوار کا ایک حصہ مقرر کر کے زمینیں یہودی رعایا کے قبضہ ہی میں رہنے دی گئیں۔ زمین کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ صرف ایران تک محدود نہیں تھا۔ شام اور مصر پر قبضہ کرنے کے بعد رومیوں نے وہاں کی اراضیات کو اصلی باشندوں سے چھین کر شاہی جاگیر قرار دیا تھا اور ان زمینوں کا بہت بڑا حصہ افسرانِ فوج، ارکینِ دربار، چرچ اور کلیسا کو دے دیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے جب شام اور مصر فتح کرلیا تو حضرت عمرؓ نے وہاں کی اراضیات کے بارے میں نہایت انقلابی اقدام کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمان جاری کیا کہ شاہی جاگیر اور رومی افسران کے قبضۂ اختیار والی ساری زمینیں اصلی باشندوں کو واپس کردی جائیں اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کردیا کہ مسلمان کسی بھی حالت میں ان زمینوں پر قابض نہیں ہو سکتے۔ ؎

حضرت عمرؓ کے اس فیصلے نے دنیا کو پہلی مرتبہ پرسنل لا کا تصور دیا۔ حکومتِ وقت کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ ساری رعایا کو مذہبی آزادی دے اور بلا لحاظ مذہب و ملت مساوی شہری، تمدنی اور انسانی

ص: حضرت عمرؓ کے استدلال کی بنیاد قرآن پاک کا سورۃ الحشر (سورۃ نمبر ۵۹) آیت نمبر ۱۰ کا یہ فقرہ تھا۔ والذین جآءو من بعدھم......

حقوق دے۔ یہ تصور نہ ایران کے کسریٰ کے پاس تھا اور نہ روم کے قیصر کے پاس۔ یہ اس مذہب کا سیاسی مسلک تھا جو آدم کی اولاد کو انسانی مساوات کا سبق پڑھانے کے لیے آیا تھا۔ زمین اور اس کی نعمتوں میں سارے انسانوں کو برابر کا حقدار گردانتا ہے۔ یہ ملوکیت کا غیر سامراجی تصور ہے۔ اسلام نو آبادیاتی نظام جہاں بانی کا سختی سے انسداد کرتا ہے۔ اس سیاسی مسلک کی بنیاد پر جو حکومت تشکیل پائی اس کے تعلق سے رعایا کے تاثرات کو علامہ شبلی نے یوں بیان کیا ہے۔ یرموک کے معرکہ میں حصہ لینے کے لیے اسلامی افواج شام کے اکثر اضلاع کو خالی کر کے جانے لگیں تو۔ "تمام عیسائی رعایا نے پکارا کہ خدا تم کو پھر اس ملک میں لائے۔" اور یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا۔ "ہمارے جیتے جی قیصر اب یہاں کبھی نہیں آ سکتا۔" [۲۴]

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف کلچرل اقدار کے حامل لوگوں کے درمیاں کئی صدیوں تک جو امن و آشتی کا ماحول بنا رہا وہ اسی سیاسی مسلک کا مرہون منت تھا۔ مسلمان ہندوستان میں بطور فاتح داخل ضرور ہوئے۔ لیکن ان کی سوچ میں نو آبادیاتی نظام کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ان کا عمل اور رویہ ایک مقامی کے مانند تھا اور اسی بنیاد پر حکومت اور رعایا کے تعلقات استوار کیے گئے اور تمام رعایا کے مذہبی عقیدوں اور معاشرتی اقدار کی حفاظت کرنا وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ چناں چہ بی این پانڈے صاحب لکھتے ہیں:

> "سندھ فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے باشندے بھی ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور ان کے مندر بھی عیسائیوں کے گرجوں، یہودیوں کے سیناگاگوں اور مگیوں کے آتشکدوں کی طرح ہیں اور ہندوستانی بھی اسی طرح اہل کتاب ہیں جس طرح عیسائی اور یہودی۔"

(قومی یک جہتی کی روایات: صفحہ ۵)

بی این پانڈے ایک جرمن سیاح فان کریمر کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں کہ:

> "محمد بن قاسم کی حکومت میں اور اس کے بعد برہمنوں کی عزت اور ان کا رتبہ جیوں کا تیوں قائم رہا۔ ہندوؤں کو کھلی اجازت تھی کہ وہ اپنے مندر بنوانے میں آزاد ہیں۔ عربوں اور سندھیوں میں اس قدر باہمی تعلقات اور محبت کے رشتے قائم ہوئے کہ جس کی وجہ سے خلیفہ تک نے سندھ میں مندر گرانے یا اسلام کے پرچار کی اجازت نہیں دی۔" (قومی یک جہتی کی روایات، صفحہ ۵)

سلطنت دہلی اور مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کا بھی یہی طرز عمل رہا ہے۔ مسلم دور میں حکومت کی طرف سے اسلام کے پرچار کی کوئی تحریک نہیں چلائی گئی۔ زمیں اور دوسرے ذرائع آمدنی کو مقامی باشندوں سے چھین کر باہر سے آئے ہوئے مسلمان فوجیوں میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ چناں چہ آبادی کے لحاظ سے ہندوستان مسلم اقلیت کا ملک ہی رہا اور ہندو اور راجپوت دور میں جو طبقے زمیں کے مالک تھے وہ مسلم دور میں جیوں کا تیوں باقی رہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں ڈاکٹر تاراچند کی تحقیق کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔[۵]

مسلم حکمرانوں کی معاشی اور معاشرتی پالیسی:

سولھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے وسط میں اتر پردیش میں جو مسلم اقتدار کا مرکز رہا ہے، زمینداروں کے اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ ہندو زمینداروں کی اکثریت تھی۔ اس گروہ میں وہ زمین دار شامل تھے جو پرانے ہندو حکمرانوں کے خاندان کے تھے۔ یہ زمیں دار مغل حکومت کو خراج ادا کرتے تھے۔ مرکزی حکومت سے ان کا رابطہ صرف لین دین کی حد تک تھا۔ سلطنت کا وسطی علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر راجپوت حکمرانوں کے ہاتھ میں تھا۔ حکومت سے ان کا رابطہ بھی صرف لین دین کی حد تک تھا۔ وہ اپنی اپنی ریاستوں کے خود مختار حاکم تھے۔ ان ریاستوں کے عوام بیرونی مذہب اور مسلم سیاسی اقتدار کے زیر اثر نہیں رہے۔ اکبر اور اس کے بعد والے حکمرانوں نے راجپوتوں سے شادی بیاہ کے تعلقات پیدا کر کے انھیں اپنی برادری میں شامل کر لیا اور راجپوت اس کے جواب میں مغل بادشاہوں، شہزادوں اور ان کے اقتدار کی حفاظت کو اپنی ہی نسلوں کی بقا سمجھتے تھے۔

مسلمان زمین داروں کی کچھ تعداد دہلی سلطنت کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ وہ یا تو مغل حکومت کے ماتحت حکمران طبقے یا افسران کے ورثا تھے یا آزاد مہم باز تھے جنھوں نے غیر آباد زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کی تعداد بہت قلیل تھی وہ بھی زیادہ تر مغربی پنجاب میں تھی۔ سندھ جہاں مسلمانوں نے تقریباً ۱۱سو سال تک حکومت کی اور وہاں صوفیائے اسلام کی تبلیغی سرگرمیوں سے آبادی کا بہت بڑا طبقہ مسلمان ہوا وہاں بھی ہندو زمین داروں کی غالب اکثریت تھی۔ مغل حکومت کی ابتدا میں اور آخر میں بھی یعنی اورنگ زیب کے انتقال کے وقت اٹھارہویں صدی میں مسلمان زمین دار بہت ہی چھوٹی اقلیت میں تھے۔ جب بنگال کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل ہوئی تو اس وقت بنگال کی جو صورت حال تھی وہ بھی ہندو زمین داروں کی بڑی اکثریت ظاہر کرتی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کل ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت ہونے کے باوجود مغربی پنجاب کو چھوڑ کر زمین پر مکمل اختیارات ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔

مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلموں پر شاہی ملازمتوں کے دروازے کھول کر انھیں حکومت کے نظم و نسق میں شامل کر لیا۔ خاص طور پر مال کا محکمہ جس کی دفتری زبان ہندوستانی تھی مسلم حکومت کے قیام کے بعد بھی ہندوؤں کے قبضہ ہی میں رہا۔ اکبر کے زمانے تک مال گزاری کے محکمے کی دفتری زبان ہندوستانی ہی برقرار رہی۔ چناں چہ سلطنت دہلی کے پورے دور میں اور اکبر کے زمانے تک مال گزاری کا محکمہ ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا۔ اکبر کے زمانے میں راجہ ٹوڈرمل نے فرمان جاری کیا کہ دفاتر کا کام فارسی میں انجام دیا جائے۔ لودھی حکومت کے دور میں، خاص طور پر سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنا شروع کیا۔ چناں چہ جب راجہ ٹوڈرمل کا فرمان جاری ہوا تو اُس وقت فارسی داں ہندوؤں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ چناں چہ دفتری زبان فارسی مقرر ہونے کے باوجود مالگزاری کا محکمہ ہندوؤں کے قبضہ ہی میں رہا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔" ایران کے بادشاہ شاہ طہماسپ صفوی نے ہمایوں کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت تب ہی ٹھہر سکتی ہے کہ وہاں کا حاکم افغانوں کو تجارت اور دوسرے پُرامن مشاغل میں لگادے اور راجپوتوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرے۔" [۱۷] ہندوستان کی حکومت شیر شاہ سوری کے ورثا سے دوبارہ حاصل کرنے کے ایک سال کے اندر ہمایوں کا انتقال ہوگیا۔ اُسے شاہ صفوی کے مشورے پر عمل کرنے کا وقت ہی نہ ملا۔ شاہ صفوی کی نصیحت اپنی جگہ۔ مغل سلطنت کے بانی بابر نے ہمایوں کو نصیحت کی تھی کہ" حکومت اس طرح کرو کہ ہندو رعایا تم سے آسودہ رہے اور تم ان کی طرف سے مطمئن رہو۔" (بابر کا وصیت نامہ جو دہلی کی نیشنل آرکائیوز میں موجود ہے)۔

اکبر نے نہایت دانش مندی سے یہی حکمتِ عملی اختیار کی اور یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ مذہبی رواداری کے ساتھ ساتھ اکبر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے تعلیم کو عام کرنے اور علوم و فنون، خصوصاً ہندو علوم و فنون کو جو سنسکرت میں مقید تھے ہندوستان کی عوامی زبانوں اور فارسی میں منتقل کرنے کا غیر معمولی اہتمام کیا اور ملک کے طول و عرض میں عوامی مدرسے کھول دیے گئے جہاں ہندو طالب علم، مسلمان طالب علموں کے شانہ بہ شانہ علم حاصل کرنے لگے۔ ہندوؤں اور کائستھوں کی خاصی بڑی تعداد نے فارسی زبان سیکھی، اسلامی علوم سے واقف ہوئے اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا سلیقہ حاصل کیا۔ اکبر اور اکبر کے بعد کے سارے مغل حکمرانوں نے باصلاحیت مقامی باشندوں کو بہت بڑی تعداد میں فوجی، دیوانی اور مال کے محکموں میں اعلیٰ اور ذمہ داری کے عہدوں پر فائز کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تختِ سلطنت پر تو مسلمان حاکم بیٹھا رہا۔ لیکن حکومت کے نظم و نسق میں برہمن، راجپوت، مغل اور پٹھان برابر برابر شریک رہے۔

مغلوں نے فوجی تنظیم کے لیے جاگیرداری نظام رائج نہیں کیا۔ جاگیرداری نظام میں جاگیردار کی وفاداریاں اپنی جاگیر سے زیادہ اور ملک کے عام مفاد سے کم ہوتی ہیں۔ مغل فوج جاگیرداری نظام کے بجائے منگولوں کے منصب داری نظام کے نمونے پر ترتیب دی گئی تھی۔ منگول ایک خانہ بدوش قوم تھے۔ چنگیز خان اور اس کے بعد والے منگول حکمرانوں نے فوجی افسران کو جاگیر عطا کر کے ان کی وفاداریوں کو مرکزی طاقت سے منحرف کر کے ایک مخصوص علاقے سے منضبط ہونے نہیں دیا۔ منصب داری نظام میں فوج کے افسر کو منصب دار کہا جاتا تھا۔ مغل فوج میں منصب داروں کے ۳۳ درجے تھے۔ سب سے چھوٹا منصب دار ۱۰ سپاہیوں کا سالار ہوتا تھا اور سب سے اونچا درجہ ۷ ہزاری منصب دار کا تھا جس کے تحت بادشاہ، پیدل اور گھوڑ سوار سپاہیوں کی تعداد کا تعین کرتا تھا۔ منصب داروں کو شاہی خزانے سے ان کے عہدوں کی مناسبت سے مقررہ رقم دی جاتی تھی۔ اس رقم میں منصب دار کی تنخواہ، اس کے ماتحت سپاہیوں کی تنخواہیں اور ان سپاہیوں کی تربیت اور سامان جنگ کے اخراجات شامل ہوتے تھے۔ مغل حکمران منصب داری کے عہدوں پر مغلوں، پٹھانوں، راجپوتوں اور مرہٹوں کو منتخب کیا کرتے تھے۔ منصب دار اپنے ماتحت سپاہیوں کو بھرتی کرنے کے بارے میں مکمل طور پر آزاد ہوتا تھا۔ عام طور پر منصب دار اپنے ہی طبقے کے لوگوں کو بھرتی کرتے تھے۔ چناں چہ مغل فوج مغلوں، پٹھانوں، راجپوتوں اور مرہٹوں کا بہترین آمیزہ تھی۔ باضابطہ شاہی فوج سے الگ بادشاہ کی اپنی ذاتی فوج بھی ہوتی تھی۔ مغل بادشاہوں نے ذاتی فوج میں راجپوتوں کو غالب اکثریت میں رکھا اور بسا اوقات شہنشاہ کی ذاتی فوج کا منصب دار (سپہ سالار) بھی کوئی راجپوت ہی ہوتا تھا۔

منصب داری نظام سے راجپوتوں نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ باہر سے آئے ہوئے مسلمان فوجی افسران کو زمین جاگیر میں نہیں ملی۔ بابر کے ساتھ آئے ہوئے مغل سردار ہندوستان کے کسی علاقے کے جاگیردار نہیں بنائے گئے۔ ان کا روزگار صرف شاہی خزانے سے جڑا رہا لیکن راجپوت وسط ہند کی ساری زمینوں پر قابض تھے اور اپنی اپنی ریاستوں میں حاکمانہ اختیارات رکھتے تھے۔ انھیں میں کے بیشتر افراد مغل فوج میں اونچے درجے کے منصب دار منتخب ہوئے۔ یوں راجپوتوں نے مغل فوج کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا اور اپنی جاگیر بھی ریاستوں کی شکل میں برقرار رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ راجپوتوں نے مغل اقتدار کو اپنا ہی اقتدار سمجھا اور اس کی حفاظت کے لیے ہر وقت کمربستہ رہے۔ مغل فوج میں ۷ ہزاری منصب سب سے اونچا عہدہ تھا۔ ۷ ہزاری منصب دار مغل فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ راجپوتوں کو ۷ ہزاری منصب تک پہنچنے کے لیے تقریباً ۱۰۰ سال کا عرصہ لگا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے دور میں راجپوت ۶ ہزاری منصب تک پہنچ کر آگے نہ بڑھ

پائے۔ اورنگ زیب کی فوج میں ۷ ہزاری منصب پانے والے ۲ راجپوتوں مرزا راجا جے سنگھ اور مہاراجا جسونت سنگھ اور ایک مرہٹہ راجا شاہو کے نام ملتے ہیں۔[۸]

راجا شاہو سمبھاجی کا بیٹا اور چھترپتی شیواجی کا پوتا تھا۔ سمبھاجی خود بھی اورنگ زیب کی فوج میں ۶ ہزاری منصب دار رہ چکا تھا۔ سمبھاجی کا دوسرا بیٹا مان سنگھ، ۳۰ اور مرہٹہ سردار اورنگ زیب کی فوج میں چھ ہزاری منصب پر فائز رہ چکے تھے۔ شیواجی کو جب مرزا راجا جے سنگھ پورندر کے قلعہ میں شکست دے کر اپنے ساتھ آگرہ لے آیا اور اورنگ زیب کے دربار میں پیش کیا تو اورنگ زیب نے شیواجی کو مغل فوج میں ۵ ہزاری منصب کا عہدہ پیش کر کے اس کی عزت افزائی کی تھی۔ شیواجی نے اس عہدے کو قبول نہیں کیا۔ وہ فوج کا سب سے بڑا عہدہ ۷ ہزاری منصب حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اورنگ زیب ایک شکست خوردہ باغی کو پہلے مرحلہ میں مغل فوج کا سپہ سالار نہیں بنا سکتا تھا۔ شیواجی اگر یہ عہدہ قبول کر لیتا تو عین ممکن تھا کہ وہ مغل فوج کے سب سے اعلیٰ عہدے پر پہنچ جاتا۔ شیواجی کی بے جا طلب سے مغل مرہٹہ اتحاد کا زرین موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔

ڈاکٹر اطہر علی نے مغل دور کے ہندو منصب داروں کے اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ ہندو منصب داروں میں راجپوت اور مرہٹہ سردار اکثریت میں تھے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق ایک ہزار اور اس سے اونچے درجے کے ہندو منصب دار اکبر کی فوج میں ۲۲ فی صد، شاہ جہاں کی فوج میں ۲۱ فی صد اور اورنگ زیب کی فوج میں ۳۲ فی صد تھے۔[۹] مغل فوج کی یہ صورت حال، خاص طور پر اورنگ زیب کے زمانے میں، اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ ہندو حکمران طبقہ جس میں راجپوت اور مرہٹے دونوں شامل ہیں ملک کے نظم و نسق میں مسلمان حکمران طبقہ جس میں مغل اور پٹھان دونوں شامل ہیں برابر برابر کا حصہ دار تھا۔

خود مختار علاقائی حکومتوں کی پالیسیاں

اکبر کے ۵۰ سالہ دور حکومت میں وسط ہند کی باج گزار ریاستوں اور دکن کی آزاد علاقائی مملکتوں کو چھوڑ کر سارا ہندوستان ایک مرکز کے تحت آ گیا تھا۔ لہٰذا دکن کی خود مختار ریاستوں میں راجا اور رعایا کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی اس کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ محمد تغلق کے زمانے میں دکن سلطنت دہلی سے علاحدہ ہو گیا۔ یہاں دو آزاد مملکتیں قائم ہوئیں۔ ایک بہمنی سلطنت اور دوسری وجیا نگر کی ہندو مملکت۔ بہمنی سلطنت کا بانی علاء الدین حسن گنگو بہمنی ہے۔ ۱۳۴۷ء میں حسن خان نے بادشاہت کا اعلان کر کے بہمنی حکومت کی بنیاد ڈالنے سے پہلے ہی اپنے نام کے ساتھ

گنگو برہمن کے نام کو جوڑ کر سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے نام سے دکن کی پہلی آزاد مسلم حکومت کی بنیاد رکھی اور گنگو برہمن کو محکمۂ مال کا وزیر مقرر کیا۔ سلطان کی تاج پوشی کی تاریخ اور وقت کا تعین کرنے کے لیے مسلمان نجومی اور برہمن پنڈت جمع ہوئے۔ نجومیوں اور پنڈتوں نے تاج پوشی کے لیے الگ الگ وقت مقرر کیا۔ سلطان نے ہندو پنڈتوں کی رائے سے اتفاق کیا اور ان کی مقرر کردہ ساعت پر تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ [۱۰]

دکن میں ہندوؤں کو اعلیٰ عہدے دینے کا عمل بہمنی حکومت کے ابتدائی زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ حسن گنگو بہمنی نے تاج پوشی جیسی اہم رسم کی بجاآوری کے لیے برہمنوں کی رائے پر عمل کر کے ہندو علوم کی برتری کا اعتراف کیا۔ بہمنی حکومت کے ۱۷۰ سالہ دور میں ہندو، خاص طور پر برہمن محکمۂ مال میں بکثرت لیے گئے اور دربار میں ہندو عالموں کا اثر ورسوخ مسلمان عالموں سے کم نہیں رہا۔ بہمنی حکومت کے بعد احمد نگر کے نظام شاہی، بیجاپور کے عادل شاہی، گولکنڈے کے قطب شاہی اور بیدر کے برید شاہی حکمرانوں نے اس طرزِ عمل کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ شاہی ملازمتوں کے دروازے بغیر کسی مذہبی امتیاز کے ہر فرقے اور چھوٹی بڑی ذاتوں کے تمام لوگوں پر کھول دیے۔

بہمنی حکمرانوں کی فوج میں جہاں مقامی ہندوؤں کی خاصی تعداد پائی جاتی تھی۔ وہیں وجیا نگر کی ہندو ریاست کی فوج میں پٹھانوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ مرہٹوں کو فوج میں بھرتی کر کے گوریلا جنگ کی تربیت کی ابتدا سلطان علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک عنبر نے کی تھی۔ نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین نے مرہٹوں کو کثیر تعداد میں اپنی اپنی باضابطہ افواج میں شامل کر لیا تھا۔ یہاں سے تربیت حاصل کر کے مرہٹے دکن کی عظیم فوجی طاقت بن کر اُبھرے اور جب شیواجی نے انھیں منظم کیا تو ان میں مغل فوج سے ٹکر لینے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

جس طرح مسلم حکمرانوں کی فوج میں اور دوسرے انتظامی محکموں میں ہندو اور برہمن شامل تھے بالکل اسی طرح شیواجی کی فوج میں مسلمان اعلیٰ اور اہم عہدوں پر فائز تھے۔

شیواجی کے اعلیٰ اور اہم افسروں میں سدی ہلال، دولت خان، قاضی حیدر، ابراہیم خان، دریا خان اور منور خان کے نام ملتے ہیں جو شیواجی کی بڑی اور بحری فوج میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں سے سدی ہلال کا تعلق مغل فوج سے تھا۔ اُس نے اورنگ زیب کا ساتھ چھوڑ کر شیواجی کے پاس نوکری کر لی تھی۔ سدی ہلال شیواجی کا بہت ہی قابل بھروسہ سپہ سالار تھا۔ اس نے کولہاپور کی جنگ میں افضل خان جیسے بہادر مغل سپہ سالار کو شکست دی تھی اور پھر امرانی کی لڑائی میں بہلول خان کو شکست دی تھی۔ [۱۱] قاضی حیدر شیواجی کا پرسنل سکریٹری تھا۔ شیواجی کی ساری خط و کتابت کا

یہ ذمہ دار تھا اور ساری خفیہ دستاویزیں اسی کے قبضہ میں رہتی تھیں ۔(ہندوستان میں قومی یک جہتی کی روایات :از بی این پانڈے ،صفحہ ۱۵)

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد ۲۰،۲۵ سال کے اندر اندر بنگال، اودھ اور دکن میں خود مختار مسلم حکومتیں قائم ہوگئیں ۔اورنگ زیب نے انتقال سے ۳ سال پہلے ۱۷۰۴ء میں مرشد قلی خان کو بنگال کا گورنر مقرر کیا تھا۔مرشد قلی خان نے ۱۷۲۵ء تک بنگال پر حکومت کی ۔اس کے دور میں محکمۂ مال کے سارے افسر ہندو تھے اور محکمۂ مال کا وزیر بھی ہندو تھا۔ بنگال میں ہندوؤں کو شاہی ملازمتیں دینے اور جاگیر عطا کرنے کا عمل مغلوں سے بہت پہلے ۱۵ ویں صدی میں الیاس شاہی اور حسین شاہی دور میں شروع ہو چکا تھا۔ سلطان علاء الدین حسین شاہ (۱۴۹۳ء تا ۱۵۳۲ء) کے زمانے میں بنگال میں ۱۲ بڑے جاگیردار تھے جو حسین شاہی حکومت کو خراج ادا کرتے تھے اور اپنی اپنی جاگیر کے اندرونی نظم ونسق میں خود مختار تھے۔ان ۱۲ جاگیرداروں میں بیر بھوم کی ایک جاگیر کو چھوڑ کر باقی ۱۱ جاگیردار ہندو تھے۔

اودھ کے گورنر نواب برہان الملک سعادت خان نے ۱۷۳۲ء میں خود مختار حکومت قائم کرلی۔ سعادت خان کے بعد نواب صفدر جنگ نے ۱۷۳۹ء سے ۱۷۵۴ء تک اودھ پر حکومت کی۔ان کا وزیر ایک ہندو راجا دیوان رائے تھا۔ صفدر جنگ کے بعد نواب شجاع الدولہ اودھ کے حاکم بنے (۱۷۵۴ء تا ۱۷۷۵ء)۔شجاع الدولہ کے فرزند نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) کا وزیر بھی ایک ہندو راجا تکیت رائے تھا۔ شاہان اودھ کے زمانے میں مندر کے پجاریوں کو شاہی خزانے سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ نواب صفدر جنگ اور ان کے وزیر دیوان رائے نے ایودھیا میں بہت سارے پرانے مندروں کی مرمت کروائی اور نئے مندر بھی بنوائے۔ ہنومان گڑھ مندر کی تعمیر کے لیے نواب نے زمین اور بہت بڑا رقمی عطیہ دیا تھا۔ ۱۹ ویں صدی کے ابتدا میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔اس تنازعہ کے بارے میں ڈاکٹر وبھوتی نارائن رائے لکھتے ہیں:

> "رام جنم بھومی تنازعہ یا مندر کو مسمار کرکے اس کی جگہ بابری مسجد تعمیر کرنے کا ذکر سب سے پہلے ایچ ار نویل کے مرتب کیے ہوئے فیض آباد ضلع گزیٹر میں کیا گیا۔ آئینِ اکبری کے مصنف ابوالفضل اور اُس وقت کے سب سے بڑے رام بھگت اور رام کتھا کے شاعر گوسوامی تلسی داس ایسے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کرتے۔ صرف ایچ ار نویل ہی یہ لکھتا ہے کہ پرانی

مسمار شدہ یادگار عمارت (مندر) کے ملبہ کوئی تاریخی عمارت (مسجد) کی
تعمیر کے لیے استعمال کیا گیا۔ ۱۹ ویں صدی میں ہی مندر کو توڑ کر مسجد
بنانے کی کہانی مشہور کی گئی اور سرکاری دستاویزات میں اس کا ذکر کیا گیا۔
ان دلائل کو بعد میں تاریخی واقعات بنالیا گیا اور اسی حیثیت سے ان کا
پروپیگنڈہ کیا گیا۔"[۲۰]

جیسے ہی رام جنم بھومی کے بارے میں یہ افواہ ریاست میں گردش کرنے لگی تو شاہان اودھ نے دو کام کیے۔ ہندو رعایا کی دل دہی کی خاطر ایودھیا کو رام جنم بھومی کے شایان شان تیرتھ استھان بنانے کے لیے شاہی خزانے کا منہ کھول دیا اور نواب شجاع الدولہ کی اہلیہ بہو بیگم نے ۱۸۱۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ کر کے ایودھیا میں امن وامان برقرار رکھنے کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال دی۔ بیگم شجاع الدولہ کو یہ معاہدہ اس لیے کرنا پڑا کہ اس وقت اودھ کی ریاست کمپنی کے زیر انتظام تھی۔ واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء) کے زمانے میں چند ہندوؤں نے بابری مسجد پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی یہ افواہ اڑی کہ بابری مسجد کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی امیٹھی کے ایک پیر مولوی امیر علی صاحب نے مسلح رضا کاروں کو تیار کر کے مسجد شہید کرنے والوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے حرکت میں آ گئے۔ نواب واجد علی شاہ نے معاہدے کا حوالہ دے کر ایسٹ انڈیا کمپنی سے درخواست کی کہ مولوی امیر علی کو بابری مسجد تک پہنچنے سے روکا جائے۔ واجد علی شاہ کی درخواست کا کمپنی نے کیا جواب دیا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وبھوتی نارائن رائے صاحب لکھتے ہیں۔ "لیکن برطانیہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ انکار فوجی نااہلیت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کے پس پردہ ایک خوب سوچی سمجھی حکمت عملی تھی جو اس مقصد سے تیار کی گئی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعی امور کو ابھارا جائے تاکہ انھیں متحد ہونے نہ دیا جائے اور غلامی کی زنجیریں کاٹ دینے سے روکا جائے۔"[۲۱] اس کے بعد واجد علی شاہ نے اپنی فوج بھیجی اور ایک طویل اور سخت لڑائی کے بعد مولوی امیر علی کو شجاع گنج بازار (حیات نگر) کے پاس ہلاک کر دیا گیا۔
اس کے بعد ۱۸۵۵ء میں سرکردہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر ایودھیا میں تصفیہ کر لیا۔

اس معاہدے کے مطابق شمال میں مسجد کے باہر چبوترے پر ہندو پوجا کر سکتے تھے اور مسلمان مسجد کے اندر نماز ادا کر سکتے تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس معاہدے پر ۱۹۴۹ء تک عمل کیا۔[۲۲]

۱۷۲۴ء میں میر قمر الدین خان نظام الملک آصف جاہ نے دکن میں آصف جاہی سلطنت کی بنیاد

ڈالی جو بعد میں ریاست حیدرآباد کے نام سے مشہور ہوئی۔ نظام الملک کے خاندان نے ۲۲۴ سال تک دکن پر حکومت کی۔ نظام الملک نے جس وقت ریاست آصفیہ کی بنیاد ڈالی اس وقت ریاست کا رقبہ تقریباً ۲ لاکھ مربع میل تھا اور وہ دریائے نربدا سے لے کر راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی۔ خلیج بنگال کا سارا جنوب مشرقی ساحلی علاقہ اس ریاست میں شامل تھا۔ انگریزوں نے مدراس میں قدم جمانے کے بعد آہستہ آہستہ کر کے نظام سرکار کا سارا ساحلی علاقہ ہڑپ کرلیا۔ تب ریاست حیدرآباد سکڑ کر ۸۲ ہزار مربع میل کی ایک ایسی شاندار حویلی بن گئی جسے دشمن سرزمین نے چاروں طرف سے گھیر کر حمل ونقل کے تمام راستوں پر پہرے بٹھادیے تھے۔

تاریخ ہند میں دولت آصفیہ کے حکمرانوں کا ایک خاص وصف رہا ہے۔ اُنھوں نے ہندوؤں کو حکومت کے نظم ونسق میں مسلمانوں سے پیچھے نہیں رکھا۔ چناں چہ نظام الملک نے حکومت کی شروعات ہی ایک ہندو امیر راجا رگھوناتھ داس کو وزیر مقرر کر کے کی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ خاندان آصفیہ کے ۷ بادشاہ ہوئے ان کے ہندو وزیروں کی تعداد بھی ۷ رہی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہر بادشاہ کے دور میں کم از کم ایک ہندو وزارت کے عہدہ پر فائز رہ چکا تھا۔ مسلم حکمرانوں کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اُنھوں نے سماج میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے تناسب میں تبدیلی لانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس سیکولر انداز جہاں بانی کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوؤں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ تخت سلطنت پر کوئی ہندو دشمن حکمران بیٹھا ہوا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے اعداد وشمار کے مطابق ریاست حیدرآباد کی جملہ آبادی ۱۶ اور ۱۷ ملین (ایک کروڑ ۶۳ لاکھ) کے درمیان تھی۔ اس آبادی کا ۳۱ فی صد (۴۷ لاکھ) ہندو، ۲۰.۳ فی صد (۶۰ لاکھ) پست اقوام اور ۱۸ فی صد (۳۰ لاکھ) مسلمان تھے۔ باقی پانچ فی صد (۷ لاکھ) میں سکھ، عیسائی اور پارسی شامل تھے۔[۱۳]

ریاست کے اندر معیشت کے تمام ذرائع پر ہندوؤں کی ہی اجارہ داری تھی۔ ۱۹۳۱ء کے اعداد وشمار کے مطابق زراعت میں ۹۲ فی صد ہندو اور ۸ فی صد مسلمان، صنعت وحرفت میں ۹۵ فی صد ہندو اور ۵ فی صد مسلمان، تجارت میں ۸۷ فی صد ہندو اور ۱۳ فی صد مسلمان، فوج اور پولیس میں ۷۸ فی صد ہندو اور ۲۲ فی صد مسلمان اور سرکاری ملازمتوں میں ۶۸ فی صد ہندو اور ۳۲ فی صد مسلمان تھے۔

مملکت حیدرآباد بڑی حد تک ایک فلاحی ریاست تھی۔ حکومت کے خزانے سے مذہبی اور سماجی اداروں، عبادت گاہوں اور مذہبی رسوم ادا کرنے والے افراد کو امداد اور تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ ۳۱،۳۷۲ منادر، ۵۱۹۱ مساجد اور ۱۱۰ چرچ ریاست کے محکمۂ امور مذہبی کی زیر نگرانی رقمی امداد سے

چلائے جاتے تھے۔ ۳۵۵، ۱۱ ہندو اداروں کو سالانہ ۹۸ ہزار روپیہ اور ۵۰۰۰ مسلم اداروں کو سالانہ ۹۴۰۰ روپیہ امداد دی جاتی تھی۔ رقمی امداد کے علاوہ مندروں کو ۴ لاکھ ایکڑ زمین جاگیر میں دی گئی تھی۔ ریاست کے باہر برٹش انڈیا کے علاقوں میں بھی امداد دی جاتی تھی۔ چناں چہ مدراس کے بھدرا چلم اور چنگل پیٹھ مندر، برار میں بالا جی مندر اور شولاپور میں مہندر مندر عثمان علی خان کی ذاتی امداد سے مستفید ہوتے تھے۔

۷ سو سالہ دور حکومت میں دکن کے مسلمان حکمرانوں نے سماج میں مسلمانوں کے تناسب کو بڑھانے کے لیے تبدیلی مذہب کی کوئی تحریک حکومت کی طرف سے نہیں چلائی۔ اچھوت ذاتوں کو جنھیں ہندو سماجی نظام نے انسانی برادری سے خارج کر دیا تھا۔ اسلام کے انسانی مساوات کا سبق پڑھایا جاتا اور انھیں سماجی عزت اور توقیر حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جاتے تو عین ممکن تھا کہ آبادی میں ہندو مسلم تناسب کی شکل ہی بدل جاتی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسی نظیر موجود تھی۔ اشوک نے چند سال کے اندر بدھ مت کو ہندوستان کا غالب مذہب بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اشوک ایک کٹر مذہبی حکمران تھا۔ کیوں کہ اس نے بودھ دھرم کی تبلیغ اور توسیع کے لیے نہ صرف اپنے رشتے داروں کو مقبوضہ علاقوں کے مختلف گوشوں میں بھیجا بلکہ اپنی حکومت کے افسران کو بھی اس کام میں لگا دیا اور مزید یہ کہ سرکاری خزانے کو استعمال کیا۔۔۔ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی راجہ، شہنشاہ، سلطان یا بادشاہ ایسا نہیں ملتا کہ جس نے اشوک کی طرح اتنے بڑے پیمانہ پر قتل عام کیا ہو، دشمنوں کو قیدی بنایا ہو اور اپنے ذاتی مذہب کے لیے سرکاری خزانے کا استعمال کیا ہو۔''[۱۵]

لیکن مسلم حکمرانوں کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ انھوں نے اپنے اقتدار کی بقا کی خاطر بڑی ذات کے ہندوؤں سے ہاتھ ملایا۔ ان کے برابر بیٹھے اور انھیں اپنے برابر بٹھایا۔ اچھوت ہزاروں سال سے بڑی ذات کے ہندوؤں کے سایے سے دور بیٹھ رہے تھے اور ان کے مندروں کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے تھے۔ مسلمانوں نے صرف اتنی مہربانی کی کہ اچھوتوں کو اپنے قدموں میں بیٹھنے کا موقع فراہم کیا۔ ان کا چھوا پانی پینے اور کھانا کھانے میں کوئی عار نہیں محسوس کیا۔ کہتے ہیں کہ ٹیپو سلطان شہید کے دسترخوان پر کھانا پروسنے والا ایک اچھوت تھا۔

یہ صورت حال صرف دکن کے لیے مخصوص نہیں تھی۔ سارے ہندوستان میں پست اقوام کی سماجی بہتری کے لیے کوئی انقلابی اقدامات نہیں کیے گئے لیکن میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے دور میں پست اقوام کی تعلیمی اور معاشی ترقی کا آغاز ہوا۔ شہری اور دیہی آبادی میں سیکڑوں مدے

کھول دیے گئے۔ چھوٹی ذاتوں، بڑی ذاتوں، کایستھوں، سکھوں، عیسائیوں اور مسلمانوں نے ملکی زبان اردو کا خیر مقدم کیا۔ چھوت چھات کی پروا کیے بغیر اپنے اپنے بچوں کو اسکولوں میں داخل کرنا شروع کیا۔ ۱۰ سال کے اندر اندر نوجوانوں کی ایک ایسی نسل تیار ہوئی جن کا مذہب مختلف تھا، عبادات کے طریقے مختلف تھے، کھانے پینے اور رہن سہن کے انداز مختلف تھے لیکن بول چال کی زبان ایک تھی۔ اخلاقی اقدار مشترک تھے اور ایک قومیت کا تصور پروان چڑھ رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کبھی ایک دوسرے کے سایے سے بھی بدکتے تھے۔ اب لنچ روم میں ایک ہی میز پر بیٹھ کر اپنے اپنے لنچ باکس کھول کر کھانے لگے تھے اور یہ نسل جب عثمانیہ یونی ورسٹی کی سیڑھیاں چڑھ کر میڈیسن، انجینیرنگ، سائنس اور سماجی علوم ملکی زبان میں پڑھ کر نکلی تو وہ ایک ایسی تہذیب کی علم بردار تھی جو مذہبی رواداری، فرقہ وارانہ یک جہتی، اخلاقی یک رنگی اور معاشی تحفظ کے چار مضبوط ستونوں پر استوار تھی۔ یہ خالص حیدرآبادی تہذیب تھی جو اردو تہذیب یا اردو کلچر کے نام سے سارے برٹش انڈیا میں جانی اور پہچانی جاتی تھی۔ میر عثمان علی خان نے پست اقوام کو دربار میں جگہ دی۔ ان کے لیڈروں کو دوسرے فرقہ کے لیڈروں کے برابر مقام دیا۔ عثمان علی خان کی سیکولر سیاست اور انسان دوستی نے سارے مذاہب کے ماننے والوں کے دل جیت لیے۔ وہ غیر مسلم رعایا میں اتنے ہی مقبول تھے جتنے کے مسلم رعایا میں۔

اس بات کا ثبوت سقوط حیدرآباد سے قبل انڈین یونین اور ریاست حیدرآباد کے درمیان مذاکرات سے چلتا ہے۔ ۱۵ اراگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ تاج برطانیہ نے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے دیسی ریاستوں کے سربراہوں کو اختیار دیا تھا کہ وہ آزاد رہیں یا ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی ایک میں شرکت کرلیں۔ میر عثمان علی خان آزاد رہنا چاہتے تھے۔ دفاع، خارجہ اور مواصلات کے امور کو انڈین یونین کے حوالے کر کے ریاست کے اندرونی نظم ونسق میں خود مختار حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے اور اس بنیاد پر انڈین یونین سے معاہدہ مفاہمت (Articles of Association) کرنا چاہتے تھے۔ معاہدہ حاصل کرنے کے لیے حیدرآبادی وفد نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل ہند سے طویل مذاکرے کیے۔ گفتگو جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی تو گورنر جنرل ہند نے استصواب عامہ (Plebiscite) کی تجویز پیش کی اور کہا کہ اس مسئلے کو جمہوری طریقہ سے حل کرنا چاہیے۔ ریاست کی ہندو اور مسلم رعایا کو یہ حق دینا چاہیے کہ وہ عوامی ووٹ کے ذریعہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں۔ آیا وہ ہندوستان سے الحاق چاہتے ہیں یا ایک مسلم حکمران کے زیر حکومت آزاد رہنا پسند کرتے ہیں۔

وفد کے لیڈر لائق علی صاحب کے لیے یہ بڑی آزمائش کی گھڑی تھی۔ ویسے حیدرآبادی وفد

استصواب عامہ کے امکان پر غور کر چکا تھا۔ چناں چہ ماؤنٹ بیٹن کی تجویز کو لائق علی صاحب نے نظام حیدرآباد کی منظوری حاصل کیے بغیر فوری قبول کرلیا۔ ماؤنٹ بیٹن خوش ہو گئے کہ انھوں نے حیدرآباد کا مسئلہ حل کرلیا ہے لیکن جب حکومت ہند کو پتہ چلا کہ حیدرآبادی وفد استصواب عامہ کے لیے راضی ہو چکا ہے تو سردار پٹیل اور پنڈت نہرو دونوں تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ کیوں کہ لائق علی کی طرح ان دونوں کو بھی یقین تھا کہ استصواب عامہ کا نتیجہ میر عثمان علی خان کے حق میں ہوگا۔ حکومت ہند خاص طور پر نہرو اور پٹیل اس حقیقت سے واقف تھے کہ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس، ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج نے مل کر جو عوامی احتجاج کے بلند بانگ دعوے کیے تھے اور جسے حیدرآباد کے باہر پریس اور حکومت ہند کے ذرائع ابلاغ نے خوب اُچھال کر یہ تاثر دیا تھا کہ حیدرآبادی عوام موجودہ سیاسی نظام کے خلاف اور ذمہ دارانہ حکومت (جمہوری حکومت) کے موافقت میں ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ مسلمانوں کے علاوہ شیڈولڈ کاسٹ کا ایک بڑا طبقہ جو اپنے لیڈر وینکٹ راؤ کے ساتھ تھا اور ہندوؤں کا ایک خاصا بڑا طبقہ جو نظام کا وفادار تھا حکومت حیدرآباد کی مخالفت اور حکومت ہند کے موافقت میں نہ تھا۔ خاص طور پر دیہاتی عوام جن پر مبالغہ آمیز پروپیگنڈہ اور ستیہ گرہ کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا اور حکومت حیدرآباد کے موجودہ نظام سے بالکل خوش تھے بادشاہ کے خلاف نہیں تھے۔ اس لحاظ سے استصواب عامہ کا نتیجہ نظام حیدرآباد کے حق میں آنے کا یقین تھا۔۱۴۳

لائق علی صاحب کا استصواب عامہ کے لیے تیار ہونا ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ ہندو اکثریت کی ریاست کے ایک مسلمان وزیراعظم کا یہ جرأت مندانہ فیصلہ واضح کرتا ہے کہ مسلم اقتدار کے دور میں راعی اور رعایا کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ برٹش انڈیا میں اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگانے والی جماعتیں ریاست حیدرآباد کی ہندو رعایا کی حق تلفی کا پروپیگنڈہ ایک عرصے سے کررہی تھیں۔ ان کا جواب دیتے ہوئے میر عثمان علی خان کے پہلے وزیراعظم مہاراجہ سرکرشن پرشاد بہادر نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ریاست کی بیشتر زمینوں پر ہم ہندو قابض ہیں۔ تجارت پر ہماری اجارہ داری ہے۔ صنعت وحرفت میں ہم مسلمانوں سے کئی قدم آگے ہیں اور مسلمانوں کے پاس کیا ہے؟ صرف سرکاری عہدے!!!۔ کرشن پرشاد نے جو کچھ فرمایا تھا اس کا ثبوت ۱۹۳۱ء کے اعداد وشمار ہیں جو پچھلے صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ ۱۸ فی صد مسلم طبقہ فوج اور پولیس میں ۴۲ فیصد اور سرکاری ملازمتوں میں ۳۲ فی صد تھا۔ لیکن اس سکے کا دوسرا رخ قابل توجہ ہے۔ ۸۱ فی صد ہندو فوج اور پولیس کے ۵۸ فی صد اور سرکاری ملازمتوں کے ۶۸ فی صد حصوں پر قابض تھے۔ میر لائق علی اس بات کو جانتے تھے کہ دکن

کے مسلم حکمرانوں نے خاص طور پر آصف جاہی حکمرانوں نے مذہبی بنیاد پر معاشی ناانصافی کا ارتکاب نہیں کیا۔ چناں چہ انھیں ریاست کی ہندو رعایا پر اتنا ہی اعتماد تھا جتنا کہ مسلم رعایا پر۔ اس اعتماد کی وجہ سے اُنھوں نے استصواب عامہ کی تجویز کو قبول کر لیا تھا۔ حکومت ہند نے فوجی طاقت کا استعمال کرنے کے بجائے اگر ریاست کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق دیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ ریاست کا الحاق انڈین یونین سے پُر امن طریقہ پر ہو جاتا اور ریاست کے ۲ لاکھ مسلم عوام کی جان کا زیاں تو نہ ہوتا۔ اگر فیصلہ میر عثمان علی خان کے حق میں ہوتا تو وہ ایک مسلمان حاکم کی جیت نہ ہوتی بلکہ ہندو مسلم یک جہتی کی جیت ہوتی۔ وہ یک جہتی جسے پروان چڑھانے کے لیے مسلمانوں نے ۷۰۰ سال تک سطح مرتفع دکن کو سیکولر طرز حکومت کا سبق پڑھایا تھا۔

حوالہ جات

۱- تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول: صفحہ ۱۷۶: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی: پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء

۲- الفاروق حصہ دوم، صفحہ ۲۴۳: علامہ شبلی نعمانی: (انگریزی ترجمہ: مولانا ظفر علی خان)

مطبوعہ انٹرنیشنل اسلامک پبلشرز، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن ۱۹۹۲ء

۳- ایضاً: صفحہ ۲۵۱

۴- ایضاً: صفحہ ۲۱۲

۵- تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول، صفحات ۱۸۸ تا ۱۸۹: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) مطبوعہ: ترقی اردو بیورو نئی دہلی: پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء

۶- ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ: صفحہ ۵۵: ڈاکٹر سید عبداللہ: مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی: اشاعت سوم: ۱۹۹۲ء

۷- ایضاً: صفحہ ۵۰

۸- اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا صفحہ ۲۹۱ تا ۲۹۲: محمد اطہر علی (مترجم: امین الدین)

مطبوعہ: ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء

۹- ایضاً: صفحہ ۵۶

۱۰- تاریخ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۳۳۷، محمد قاسم فرشتہ (ترجمہ: عبدالحیٔ خواجہ ایم۔اے) مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹیڈ، پبلشرز لاہور

۱۱- اورنگ زیب اور ہندوؤں کے ساتھ اس کے تعلقات: صفحہ ۸۱: اکھیلیش جائسوال (نوٹ: ڈاکٹر اکھلیش جائسوال کی کتاب ہمیں خدابخش اورینٹل لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار صاحب نے فراہم کی ہے۔ اس کتاب کا سرورق غائب ہے، اس لیے ہم اس کے ناشر کا نام اور تاریخ اشاعت نہیں دے سکے)

۱۲- فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس: صفحہ ۳۸: وبھوتی نارائن رائے (مترجم: معصوم مرادآبادی) مطبوعہ خبردار پبلی کیشنز دہلی، پہلا ایڈیشن ۲۰۰۲ء

۱۳- ایضاً۔ صفحہ ۲۴

۱۴- زوال حیدرآباد: صفحہ ۳۱ تا ۳۲: سید حسین: مطبوعہ: سنٹر فار مینارٹیز اسٹڈیز، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد (دکن) ستمبر ۲۰۰۱ء

۱۵- اورنگ زیب۔ ایک نیا زاویہ نظر: صفحہ ۳: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد (مترجم: فیضان رشید) مطبوعہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، پہلا اڈیشن ۱۹۹۰ء

چوتھا باب:

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد

۱- پس منظر

۲- ہندوستان کے بحری راستے کی دریافت

۳- ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام

۴- ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں

۵- ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی عزائم

۶- حوالہ جات

پس منظر

مشرق اور مغرب کے تجارتی تعلقات بہت قدیم ہیں۔ مغرب کے تاجر قسطنطنیہ (موجودہ نام استنبول)، اسکندریہ اور حلب کے بازاروں میں لین دین کیا کرتے تھے۔ پندرہویں صدی، میں جب بحیرۂ روم کے پانیوں پر سلاطین ترک اور یورپین اقوام کی لڑائیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تو مغرب کے تجارتی قافلوں کا براہ راست مملکت آل عثمان میں داخلہ دشوار ہوگیا۔ تب یورپ کی قوموں کو ان ملکوں تک پہنچنے کا خیال آیا جہاں گرم مسالے، نیل، تیل کے بیج، نفیس سوتی اور ریشمی کپڑے مل سکتے تھے۔ مغرب، مشرقی ممالک کے ساحلوں تک شاید کبھی نہ پہنچ پاتا اگر اسپین کے اسلامی دارالعلوم پہلے سے علم وحکمت کی قندیلیں نہ روشن کی ہوتیں۔ غرناطہ اور قرطبہ کے مدرسوں میں ہیئت، جغرافیہ، ریاضی، علم ہندسہ، عمرانیات اور تاریخ سیکھنے کے لیے یورپ کے طالب علم آتے تھے اور واپس جا کر اپنے ملکوں میں علم وتحقیق کی مشعلیں روشن کرتے تھے۔ یورپ کے ملاح زمین کو چپٹی تھالی سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ ساحل سے زیادہ دور جانے کی ہمت ہی نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ساحل سے دور جانے پر واپسی ناممکن ہوگی۔ یورپ کے اس تاریک دور میں اسلامی اسپین جو عقلی علوم کا مرکز تھا، علم کی روشنی پھیلا کر ان باطل تصورات کو دور کر رہا تھا۔[1] اسپین میں جہاز رانی کا فن اتنی ترقی کر چکا تھا کہ سنین اسلام کے مصنف کے مطابق گیارہویں صدی عیسوی میں اندلس کے مسلمان جہاز رانوں نے امریکہ دریافت کر لیا تھا۔[2] لیکن اس واقعہ کو تاریخ کے صفحات سے مٹا دیا گیا۔ اسپین اور پرتگال کے عیسائیوں نے جہاز رانی کا فن اور سمندر میں دور تک سفر کرنے کا حوصلہ مسلمانوں سے سیکھا۔

اسلامی اسپین کو ختم کرنے کے بعد عیسائی حکمران افریقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسپین سے ہزاروں مسلمان ہجرت کر کے افریقہ کے شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ آباد ہو گئے تھے۔ انھیں ٹھکانے لگانے کے لیے عیسائی اسپین نے افریقہ کی طرف فوجی مہمات روانہ کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح ایک انتقامی جذبے کے زیر اثر یورپ سب سے پہلے افریقہ کے جغرافیہ سے واقف ہوا اور اسے تبلیغی سرگرمیوں کے لیے نیا میدان ہاتھ آیا۔ ان ہی مہمات کے دوران پرتگالی جہاز راں راس امید تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہندوستان کے بحری راستے کی دریافت

پندرہویں اور سولہویں صدی کا ہندوستان صنعت وحرفت میں اپنی مثال آپ تھا۔ دنیا کا کوئی ملک

اس حوالے سے ہندوستان کا اہم پہلو نہیں تھا۔ ہندوستان کے صنعتی مال کی مانگ ساری دنیا میں تھی۔ خاص طور پر کاغذ، شکر، چینی کے ظروف، چمڑے کی اشیاء، سوتی، اونی اور ریشمی کپڑے عرب، شام، ایران اور ایشیائے کوچک تک جاتے تھے۔ اس زمانے میں زر مبادلہ سونے کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا۔ لہٰذا دنیا کا سونا کھنچ کر ہندوستان پہنچ رہا تھا۔ اسی لیے دنیا ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہتی تھی۔ یورپ کے تاجر اس بین الاقوامی تجارت میں حصہ دار بننے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ یورپ کو ہندوستان پہنچنے کے لیے ترکان آل عثمان کی سرزمین سے گزر کر بری راستے سے سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ نہایت ہی صبر آزما مرحلہ تھا۔ جب پرتگالی جہاز راں راس امید تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ہندوستان کے بحری راستے کی دریافت کی مہم تیز ہو گئی۔ چنانچہ کولمبس ہندوستان کے مشرقی ساحل تک پہنچنے کی امید میں بحر اٹلانٹک کو پار کر کے ہندوستان کے بجائے امریکہ کے مغربی ساحل پر پہنچ گیا۔

۱۴۹۸ء میں پرتگالی جہاز راں واسکوڈی گاما ایک عرب ملاح کی مدد سے جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر مالندی کے راستے کالی کٹ پہنچ گیا۔ اس طرح یورپ اور ہندوستان کے درمیان بحری راستہ دریافت ہوا۔ ۱۵۰۱ء میں پرتگالیوں نے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سے گوا کی بندرگاہ چھین لی۔ شہر کے مسلمانوں کو قتل کر کے گوا میں یورپین اقوام کی پہلی نو آبادی قائم کی گئی۔ پرتگالیوں کے بعد ولندیزی، فرانسیسی اور برطانیہ کے لوگ بھی مشرقی ملکوں میں آنا شروع ہوئے۔ ابتداء میں یورپ کی ان مہمات کا مقصد تجارت تھا۔ یورپ کے تاجر مشرقی ملکوں کا صنعتی سامان، کافی اور مسالے یورپ لے جاتے تھے۔ انگریز ایک عرصے تک خاموش تماشائی بنے رہے اور یورپ کی دوسری قومیں خاص طور پر ڈچ مشرق کی منڈیوں پر چھا گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام:

ہندوستان سے تجارت کرنے کی غرض سے برطانیہ میں ۱۵۷۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی۔ ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبیتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو شاہی فرمان عطا کیا۔ جس کی رو سے کمپنی کو ۱۵ سال کے لیے بلاشرکت غیرے ہندوستان سے تجارت کرنے اور ہندوستان میں جائداد حاصل کر کے کالونی بنانے کے حقوق مل گئے۔ فرمان میں یہ صراحت بھی کی گئی تھی کہ کمپنی ایک کورٹ آف ڈائریکٹر منتخب کرے گی۔ جس میں ایک گورنر، ایک ڈپٹی گورنر اور ۲۴ ممبر ہوں گے۔ تاج برطانیہ نے کمپنی کے اندرونی انتظام پر اقتدار اپنے اور پریوی کونسل کے ہاتھ میں رکھا تھا۔

۱۶۸۸ء میں تاج برطانیہ کے شاہی اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل ہو گئے۔ پارلیمنٹ ایسٹ انڈیا کمپنی

کے اختیارات کو محدود کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پارلیمنٹ نے یہ کام نہیں کیا۔ اس کے بجائے ۱۶۹۸ء میں پارلیمنٹ ایکٹ کے ذریعہ ایک نئی کمپنی "جدید ایسٹ انڈیا کمپنی" قائم کی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام شاہی فرمان کے ذریعہ ہوا تھا۔ اور نئی کمپنی پارلیمنٹ ایکٹ کے ذریعہ وجود میں آئی تھی۔ پارلیمنٹ کے اس عمل نے ایک دھما کو صورت حال پیدا کردی۔ دونوں کمپنیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ ویسے بھی یورپ کی مختلف کمپنیاں اپنے تجارتی اور نو آبادی مفادات کے تحفظ کے لیے آپس میں بحری اور بری جنگیں شروع کر رکھی تھیں۔ چنانچہ سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک ۲۰۰ سال ایشیا کے سمندروں پر خون کی ہوئی کھیلی جاتی رہی۔ قدیم اور جدید ایسٹ انڈیا کمپنیوں کا ٹکراؤ برطانیہ کے قومی مفادات کے خلاف جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۷۰۸ء میں پارلیمنٹ نے جدید ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ضم کردیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان میں

سولہویں صدی کے ختم پر اکبر اعظم کے دور حکومت میں انگریز تاجر ایسٹ انڈیا کمپنی کا جھنڈا لہراتے ہندوستان میں داخل ہوئے (۱۶۰۱ء)۔ اور ایک عرصے تک معمولی تاجروں کی طرح تجارت میں مصروف رہے۔ ۱۶۰۸ء میں برطانیہ کا پہلا سفیر مسٹر ہاکنس جہانگیر کے دربار میں آیا۔ جہانگیر نے کمپنی کو سورت میں تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے سات سال بعد دوسرا سفیر سر ٹامس رو جہانگیر ہی کے دربار میں آیا۔ اس سفارت کے بعد کمپنی کے گودام سورت کے علاوہ احمد آباد، برہان پور، اجمیر، آگرہ، کھمبات وغیرہ میں قائم ہوگئے۔ اس طرح ۱۰، ۱۲ سال کے اندر اندر کمپنی کی تجارت کو غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ ۱۶۱۳ء میں کمپنی نے حکومت برطانیہ کو ۱۳ ہزار پونڈ محصول ادا کیا۔ اور ۱۶۶۲ء میں محصول کی رقم ۳۰ ہزار پونڈ تک پہنچ گئی۔ پہلے ۲۰ سال میں کمپنی نے ہندوستان سے تقریباً ۶ لاکھ پونڈ کی تجارت کی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی یقیناً تجارت کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ لیکن تاج برطانیہ کی طرف سے کمپنی کو جو مراعات اور اختیارات عطا کیے گئے تھے اس سے ان کے حقیقی عزائم کا پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کا مقصد صرف تجارت نہیں تھا۔ خاص طور پر ۱۶۰۸ء اور ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے دوران کی مدت میں برٹش پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو جس انداز سے نوازا تھا اور اس کے اختیارارت میں اضافہ کیا تھا اس سے انگریزوں کے اصل مقصد کا پتہ چلتا ہے۔ کمپنی کو ہندوستان میں قانونی اور ضرورت پڑنے پر بہ زور شمشیر تجارت کرنے، مالگزاری ادا کرنے والے علاقے حاصل کرنے، سکہ بنانے، ٹیکس لگانے، بندرگاہ تعمیر کرنے، فوج کی تنظیم کرنے اور جنگ وصلح کے مکمل اختیارات عطا کیے گئے۔ اس کے علاوہ کمپنی کو عدالتیں قائم کرنے کا

بھی اختیار دیا گیا تھا۔ یعنی برٹش پارلیمنٹ نے ہندوستان کو اپنی نو آبادی تصور کر کے وہاں حکومت قائم کرنے اور اُسے چلانے کے سارے اختیارات کمپنی بہادر کو سونپ دیے اور طرفہ تماشا یہ کہ لندن میں برٹش پارلیمنٹ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا نقشہ پیش کر رہی تھی اور ادھر ہندوستان میں کیا ہو رہا تھا تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں اور حکمران طبقے کو ان باتوں کا علم رہا ہو۔ ہندوستان اور برطانیہ کے سفارتی تعلقات کا بھی پتہ نہیں چلتا ہے کہ ہندوستان کا کوئی نمائندہ لندن میں بیٹھ کر برطانیہ کی خارجہ پالیسی میں جو انقلاب آ رہا تھا اس سے واقفیت حاصل کر رہا ہو۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی عزائم

شہنشاہ جہانگیر نے کمپنی کو سب سے پہلے گجرات کے ساحلی شہر سورت میں تجارتی گودام اور دفتر قائم کرنے کی اجازت دی۔ ۱۶۳۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس میں سینٹ جارج کا قلعہ تعمیر کیا۔ ۱۶۶۸ء میں بمبئی میں تجارتی کوٹھی بنائی۔ اور ۱۶۹۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کا قلعہ تعمیر کیا۔ ۱۶۳۹ء سے ۱۶۸۹ء تک کمپنی کی تجارت نے غیر معمولی ترقی کی۔ اور اس کے خزانے میں اتنا سرمایہ جمع ہو گیا کہ وہ تجارت کے دائرے سے نکل کر اقتدار اور ہندوستان پر حکومت کے خواب دیکھنے لگی۔ سب سے پہلے کمپنی نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر لیا اور قلعوں کے اندر مضبوط مورچے تعمیر کیے۔ اور فوجی چھاؤنیاں بنالیں۔ کمپنی کے ایک ڈائریکٹر سر جان چائلڈز کی سرکردگی میں پیدل افواج کی کئی کمپنیاں قائم کی گئیں۔ برطانیہ سے ایک اعلیٰ فوجی افسر اور ایک تربیت یافتہ فوجی کمپنی بلائی گئی۔ اب ایسٹ انڈیا کمپنی نہ صرف چھوٹے چھوٹے مقامی حکمرانوں بلکہ شہنشاہ ہند سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ چنانچہ مدراس اور بمبئی میں کمپنی کے تجارتی گوداموں کے اطراف اور قلعوں کے باہر بھی مضبوط مورچے تعمیر کیے گئے۔ ہگلی اور چٹاگانگ پر زبردستی قبضہ کر لیا گیا۔ ہگلی اور سمندر کے قریب کی ایک بندرگاہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ خلیج بنگال میں جزیرہ فلفا کو فوجی ہیڈ کوارٹر بنا کر وہاں ایک مختصر بحری بیڑا تعینات کر دیا گیا۔

اس فوجی سرگرمی کے نتیجے میں بنگال کے گورنر شائستہ خان فوری حرکت میں آ گئے۔ بنگال کی افواج نے ہگلی اور چٹاگانگ پر حملہ کر کے انگریزوں کو ان علاقوں سے مار مار کر بھگا دیا۔ ملک کے دوسرے علاقوں میں مغل فوج نے فوری کارروائی کی۔ سورت، میسولی پٹم، وزیگا پٹم اور بمبئی کے قلعے اور تجارتی کوٹھیاں انگریزوں سے چھین لیں۔ اس ذلت آمیز پسپائی سے انگریز پریشان ہو گئے۔ اور شہنشاہ کے دربار میں معافی نامہ داخل کیا۔ اورنگ زیب نے انگریزوں کے ایجنٹ کو دربار میں

طلب کیا۔ ان کی معافی کی درخواست کو سماعت فرمایا۔ اور حسب ذیل شرائط پر انھیں معافی دے دی گئی۔ (۱) کمپنی کو پابند کر دیا گیا کہ فوجی کارروائی سے حکومت وقت کو جو نقصان ہوا ہے اسے ادا کیا جائے۔ (۲) کمپنی نے ہندوستانی تاجروں سے جو قرضے حاصل کیے ہیں ان کی فوری ادائگی کی جائے اور (۳) سرجان چائلڈز کو ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ ۵

کمپنی نے ان مطالبات کو پورا کیا تو اس کی تجارتی کوٹھیاں اور قلعے اسے واپس مل گئے۔ اور تجارتی مراعات کو بحال کر دیا گیا۔ اس تلخ تجربے کے بعد کمپنی نے اپنے رویے میں فوری اصلاح کر لی۔ سرکشی اور سینہ زوری کے بجائے خوشامد اور چاپلوسی کی پالیسی اختیار کی تاکہ شہنشاہ ہند سے مراعات اور رعایتیں حاصل کر سکیں آئندہ ۴۰، ۵۰ سال تک کمپنی نہایت امن وامان سے صرف تجارت میں مشغول رہی اور ہندوستانی حکمرانوں کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں فراہم کیا۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہو گیا اور مغل شہزادے جانشینی کی جنگ میں مبتلا ہو گئے۔ اس افسوس ناک صورت حال کی وجہ سے مغل فوجوں کی ساری قوت خانہ جنگی میں صرف ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مشکلات کا دور بھی ختم ہو گیا۔ اس وقت تک کمپنی کے دو یورپین رقیب پرتگالی اور ڈچ میدان چھوڑ چکے تھے۔ اور ہندوستان کے تین اہم مقامات میں کمپنی کے قدم مضبوطی سے جم گئے تھے۔ مغربی ساحل پر بمبئی، کارومنڈل ساحل پر مدارس اور بنگال میں کلکتہ نہ صرف اس کے تجارتی مراکز تھے بلکہ قلعے اور فوجی چھاؤنیاں بھی وہاں بن چکی تھیں ان تینوں مرکزوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جہاں مغل فوج آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔ وہاں سے انگریزوں کو وہی طاقت بے دخل کر سکتی تھی جو ان مقامات کے اردگرد سمندروں پر بحری قدرت رکھتی ہو۔ مغلوں کی یہ کوتاہ اندیشی تھی کہ انھوں نے سمندروں پر حکمرانی کا سوچا ہی نہیں۔ درحقیقت وہ اپنی غیر معمولی بری عسکری قوت کے زعم میں ایسی ناعاقبت اندیش احساس برتری میں مبتلا ہو چکے تھے کہ بادبانوں کو لہراتے ہوئے آنے والے کسی حملہ آور کا انھیں کوئی تصور ہی نہ رہا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ابھی تک مالگزاری ادا کرنے والے علاقوں پر قبضہ نہیں کر پائی تھی۔ لیکن تجارت میں اس کو بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ ۱۷۰۸ء میں انگلستان سے تیار شدہ مال کی درآمد صرف ۶۰ ہزار پونڈ تھی۔ ۱۷۳۸ء میں اس کی مقدار بڑھ کر ایک لاکھ اٹھائیس ہزار پونڈ تک پہنچ گئی۔ اور ہندوستان سے جو خام مال انگلستان بھیجا گیا اس کی مالیت ابتدا میں پانچ لاکھ پونڈ تھی جو بڑھ کر دس لاکھ پونڈ ہو گئی۔ یعنی انگلستان میں صنعتی انقلاب کی ابتدا ہو چکی تھی اور یہ انقلاب ہندوستان کی دولت سے برپا ہو رہا تھا۔ صنعتی انقلاب کے لیے ہندوستان برطانیہ کو دولت، خام مال اور تیار شدہ

مال کی منڈی تینوں بنیادی عناصر فراہم کر رہا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے جال میں نہ جکڑا جاتا تو صنعتی انقلاب کی ابتدا ہندوستان سے ہوتی۔

اس تجارتی تبادلے سے کمپنی اتنی مال دار ہو گئی تھی کہ کمپنی نے حکومت برطانیہ کو ۱۷۴۴ء میں دس لاکھ پونڈ اور ۱۷۵۰ء میں چالیس لاکھ پونڈ قرض دیے۔۶ اس زمانے میں شمالی امریکہ برطانیہ کے زیر اقتدار تھا۔ وہاں کے حاصل شدہ ٹیکس سے وہاں کے حکومتی اخراجات پورے نہیں ہو رہے تھے۔ امریکی حکومت چلانے کے لیے برطانیہ کے خزانے پر غیر معمولی بار پڑ رہا تھا۔ ایسے میں ہندوستان سے آنے والی دولت برطانیہ کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔

چالیس، پچاس سال کی پر امن تجارت کے بعد ۱۷۴۰ء کے لگ بھگ جب کہ عظیم الشان مغل سلطنت کی عمارت زمیں بوس ہو رہی تھی تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ کمپنی کے عزائم بلند تھے۔ اس کا خزانہ معمور تھا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات اس کے حق میں تھے اور کمپنی کی سربراہی لارڈ کلایو جیسی شخصیت کے ہاتھ میں تھی جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ اور بنگال کی سرزمین سے انگریزی راج کا پودا پھوٹ نکلا۔

حوالہ جات :

۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل: صفحہ ۳۵: سید طفیل احمد منگلوری (علیگ): مطبوعہ: محمد سمیع اللہ قاسمی و کتب خانہ عزیزیہ، دہلی، مطبع علیمی دہلی: پانچواں ایڈیشن ۱۹۴۵ء۔

۲۔ تاریخ اسلام حصہ سوم: صفحہ ۱۷۷: مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی: ناشر: نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع یازدھم ۱۹۸۲ء۔

۳۔ تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول صفحہ ۲۸۷: ڈاکٹر تاراچند (مترجم: قاضی محمد عدیل عباسی) مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ پہلا اڈیشن ۱۹۸۰ء۔

۴۔ ایضاً صفحہ ۲۸۹

۵۔ ایضاً: صفحہ ۲۹۷

۶۔ ایضاً: صفحہ ۲۹۹

پانچواں باب:

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

۱۔ علاقائی حکمرانوں کی دفاعی کارروائیاں

۲۔ بنگال میں دفاعی کارروائیاں

۳۔ دکن میں دفاعی کارروائیاں

۴۔ میسور۔ انگریز پہلی جنگ

۵۔ میسور۔ انگریز دوسری جنگ

۶۔ میسور۔ انگریز تیسری جنگ

۷۔ میسور۔ انگریز چوتھی جنگ

۸۔ مرہٹوں کا زوال

۹۔ عوامی بغاوتیں: پس منظر

۱۰۔ حوالہ جات

علاقائی حکمرانوں کی دفاعی کاروائیاں

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ملک چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں بٹ گیا۔ مہاراشٹر، گجرات، مالوہ اور وسط ہند میں مرہٹے، بنگال میں علی وردی خان، اودھ میں برہان الملک، روہیل کھنڈ میں افغان سردار حافظ رحمت خان اور دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے خودمختار حکومتیں قائم کرلیں۔ اس طرح مغلیہ مرکزی حکومت کی عظیم الشان فوجی اور مالی قوت چھوٹی چھوٹی کمزور اکائیوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس سیاسی انارکی سے فائدہ اٹھا کر سکھوں نے آہستہ آہستہ کر کے پنجاب میں آزاد حکومت قائم کرلی۔ نظام الملک کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں اور نواسے کے درمیان جانشینی کی جنگ شروع ہوگئی۔ اس خانہ جنگی کی وجہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو دکن کی سیاست میں دخل دینے کے مواقع حاصل ہوئے۔ محمد علی والا جاہ نے انگریزوں کی مدد سے کرناٹک کے صوبہ میں اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی۔ محمد علی والا جاہ کی حیثیت ایک نواب کی تھی اصل اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کا تھا۔ اس طرح انگریزوں کے قدم مدراس میں جم گئے۔ اس وقت جنوبی ہند میں حیدر علی ایک فوجی قوت بن کر ابھر رہا تھا۔ میسور کی ایک چھوٹی سی جاگیر کو حیدر علی نے ایک خوشحال اور طاقتور ریاست میں تبدیل کر دیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے مغل سلطنت سے ٹکر لینے کی ضرورت نہیں پیش آئی بلکہ ان علاقائی حکمرانوں سے جنگ کرنی پڑی۔ انگریز ایک ایک کر کے علاقائی حکمرانوں کو ختم کرتے چلے گئے۔ علاقائی حکومتوں کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے معمولی عسکری قوت سے کام لیا ہے۔ ''اس گھر کو آگ لگ گئی'' کے دیباچہ میں ڈاکٹر خلیق انجم عاشور کاظمی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ اپنی طاقت کے بل پر نہیں بلکہ سازشوں اور جاسوسی کے بہتر نظام سے کیا۔ وہ ہندوستانیوں کی اس کمزوری سے واقف ہو چکے تھے کہ معمولی سی دولت یا عہدے کا لالچ دے کر بعض ہندوستانیوں کو خریدا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے لے کر ۱۵ راگست ۱۹۴۷ تک ہندوستان میں انگریزوں کی تاریخ، سازش، جاسوسی اور ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی طویل داستان ہے۔ اگر میر جعفر جیسا غدار بنگال میں نہ ہوتا تو پلاسی کی لڑائی میں نواب سراج الدولہ انھیں ہندوستان سے فرار ہونے پر مجبور کر دیتے۔''

پلاسی کی لڑائی علاقائی حکمرانوں کی پہلی دفاعی کارروائی ہے۔ اگر چہ کہ یہ لڑائی کوئی بڑی خون ریز جنگ نہیں تھی۔ لیکن اس لڑائی نے ہندوستان میں افسوس ناک سیاسی انقلاب کا راستہ ہموار کر دیا۔

بنگال میں دفاعی کاروائیاں

بنگال ایک بڑی اور خوشحال ریاست تھی۔ بنگال کے نواب علی وردی خان کے انتقال کے بعد ان کا پوتا سراج الدولہ ۱۷۵۶ء میں بنگال کا حکمران بنا۔ علی وردی خان کے انتقال کے بعد انگریزوں نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ فورٹ ولیم کو وسعت دے کر زبردست فوجی چھاؤنی بنا دیا گیا۔ سراج الدولہ نے انگریزوں کو فوجی تیاریاں ختم کرنے کا حکم دیا۔ جب انگریز نہیں مانے تو سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر حملہ کر کے وہاں سے انگریزوں کو نکال دیا۔ انگریز گورنر اپنی فوج لے کر بحری بیڑے کے ساتھ جزیرہ فلتا چلا گیا اور مدراس کو مدد کے لیے اطلاع دی۔ مدراس سے کلائیو کی سرکردگی میں فوجی امداد روانہ کی گئی۔ لڑائی سے پہلے کلائیو نے جگت سیٹھ اومی چند کو ملا کر اس کے ذریعہ نواب کے سپہ سالار میر جعفر کو غداری پر آمادہ کر لیا۔ کلائیو کی سرکردگی میں انگریز فوجیں ۱۳ر جون ۱۷۵۷ء کو کلکتہ سے نکلیں۔ ۲۳ر جون ۱۷۵۷ء کو بھاگیرتی ندی کے کنارے پلاسی کے مقام پر پہلی دفاعی جنگ لڑی گئی۔ سراج الدولہ کی فوج کا بڑا حصہ جو میر جعفر، رولبھ رام اور یار لطف خاں کے زیر کمان تھا عین لڑائی کے دوران نواب کی فوج سے الگ ہو گیا۔ میر مدن اور مہاراجہ موہن لال تھوڑی سی فوج لے کر نواب کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے۔ میر مدن اور موہن لال انگریزی توپ خانے کے قریب پہنچ گئے۔ انگریزی فوجیں پسپا ہونے لگیں۔ میدان کے ایک سرے پر آموں کے باغ میں جا کر ٹھہر گئیں۔ کلائیو نواب کی فوج کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ کر میر جعفر کے نمائندے پر برس پڑا۔؎

''تمہارے آقا نے تو کہا تھا کہ فوج اور سپہ سالار سب سراج الدولہ سے بگڑ گئے ہیں اور لڑائی شروع ہوتے ہی اس کا کام تمام کر دیں گے۔ مگر مجھے تو اس کے برعکس نظر آتا ہے۔''

عین اُس وقت جب میر مدن انگریزوں کے سر پر پہنچ چکا تھا ایک گولے سے زخمی ہو کر شہید ہو گیا۔ میر مدن کی شہادت نے نواب کو دل شکستہ کر دیا۔ شام ہو رہی تھی مگر بہادر مہاراجہ موہن لال برابر انگریزوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور قریب تھا کہ فیصلہ ہو جاتا، غدار میر جعفر نے نواب کو مشورہ دیا کہ وہ صبح ہوتے ہی جنگ شروع کرے گا، اس وقت فوج کو واپس بلا لیا جائے۔ نواب نے دل برداشتہ ہو کر مہاراجہ موہن لال کو پسپائی کا حکم دیا۔ موہن لال کے پیچھے ہٹتے ہی فوج بددل ہو گئی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ سارا کیمپ خالی ہو گیا۔ انگریزوں نے نواب سراج الدولہ کو گرفتار کر لیا اور کلائیو کے حکم سے نہایت دردناک طریقہ سے جسم کو کاٹ کر قتل کر دیا گیا۔ بعد ازاں ان کی نعش کو ہاتھی پر رکھ کر تمام شہر میں پھرایا گیا۔ مہاراجہ موہن لال کو بھی بے حد تکلیف دے کر قتل کر دیا گیا۔

سراج الدولہ سے عوام کو جو بے پناہ محبت اور عقیدت تھی اس کا اندازہ مرشد آباد کے کہرام سے ہوتا ہے۔ مرشد آباد کی گلیوں میں ہزاروں انسان، ہندو اور مسلمان، سراج الدولہ کی نعش کے ساتھ آہ و زاری کرتے ہوئے پہلے شہید حکمران کا ماتم کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ یہ خبر جب عظیم آباد (پٹنہ) پہنچی تو راجہ رام موہن نرائن صوبہ دار عظیم آباد نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور روتا ہوا دیوانہ وار بازار میں نکل پڑا۔ اس کے پیچھے بے پناہ ہجوم نے کہرام مچا رکھا تھا۔ رام نرائن روتے ہوئے یہ شعر پڑھتا جاتا تھا:[۳۳]

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری   ص ص

بیر بھوم کے جاگیر دار نواب بدیع الزماں کو جب یہ خبر ملی تو وہ فقیرانہ لباس پہن کر جنگل کی طرف نکل گیا۔

پلاسی کی لڑائی انگریزوں نے بہت ہی کم سپاہیوں کے جانی نقصان سے جیتی تھی۔ انگریزوں کی طرف سے سات یوروپین سپاہی اور ۱۷ ہندوستانی سپاہی مارے گئے۔ اور ۱۳ یوروپین اور ۳۶ ہندوستانی سپاہی زخمی ہوئے۔ دشمن فوج کا اتنا کم جانی نقصان اس لیے ہوا کہ نواب کے سپہ سالار میر جعفر کی زیر کمان فوج نے لڑائی میں مطلق حصہ نہیں لیا۔ پلاسی نے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کے سب سے دولت مند صوبہ پر حاکمانہ اقتدار حاصل ہوا جس سے ۲۶ ملین روپیہ سالانہ کے محاصل حاصل ہوتے تھے۔[۳۴]

بنگال کو انگریزی تسلط سے بچانے کی آخری کوشش میر قاسم نے کی۔ کمپنی نے ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کو معزول کر کے اس کے داماد میر قاسم کو بنگال کا نواب بنا دیا۔ چند سال کے بعد ہی کمپنی میر قاسم سے ناراض ہوگئی اور ۱۷۶۳ء میں میر قاسم کو ہٹا کر دوبارہ میر جعفر کو بنگال کا نواب بنایا گیا۔ میر قاسم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو چیلنج کیا۔ اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ شاہ عالم کے ساتھ مل کر پٹنہ کے قریب بکسر کے مقام پر ۱۷۶۵ء میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں بھی ہندوستانی فوجوں کو شکست ہوئی۔ یہاں میر جعفر کا کردار میر قاسم کے فوجی سردار نجف خان نے ادا کیا۔ میر قاسم اور شجاع الدولہ کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا اور بادشاہ شاہ عالم کو انگریزوں نے الہ آباد میں نظر بند کر دیا۔ اور مغل شہنشاہ سے بنگال اور بہار کی دیوانی کی سند حاصل کر لی۔ بکسر کی لڑائی نے انگریزوں کو بنگال کا قانونی حکمراں بنا دیا۔ نواب اودھ سے معاہدہ کر کے ایسٹ انڈیا

ص ص "تذکرہ مسرت افزا" مصنفہ ابوالحسن امر اللہ الہ آبادی مخطوطہ برٹش میوزیم میں یہ شعر مشتاق بخاری کے نام سے دیا گیا ہے اور ردیف "ویرانے پہ کیا گزرا" ہے جو اس زمانے کا عام محاورہ تھی۔

کمپنی نے بنگال کی مغربی سرحدوں کو محفوظ کرلیا اور شہنشاہ ہند کی پوزیشن کو گھٹا کر ان کو کمپنی کا وظیفہ خوار بنادیا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مغل حکومت کے دوبارہ واپس آنے کے امکان کو ختم کر دیا۔۵

دکن میں دفاعی کارروائیاں

جن دنوں سراج الدولہ پلاسی کے میدان جنگ میں اپنی جان اور مال کی قربانی پیش کر رہے تھے۔ انھیں دنوں جنوبی ہند کی چھوٹی سی جاگیردار میسور کا ہندو راجہ کرشنا اوڑیر حیدر علی کی فوجی صلاحیت سے متاثر ہو کر اسے فتح حیدر بہادر کا خطاب دے کر اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کر رہا تھا۔ یہ وہی حیدر علی اور اس کا نامور بیٹا ٹیپو سلطان ہیں جن کی شہادت سے پہلے انگریزوں کو یقین نہیں تھا کہ وہ ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کو زنجیر غلامی میں پوری طرح جکڑنے اور مکمل اقتدار حاصل کرنے کے لیے انگریزوں کو جنوبی ہند میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے مسلسل ۳۰ سال تک چار بڑی جنگیں لڑنی پڑیں۔

میسور-انگریز پہلی جنگ ۱۷۶۷ء تا اپریل ۱۷۶۹ء

میسور کی پہلی جنگ انگریزوں سے اگست ۱۷۶۷ء میں شروع ہوئی۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے مل کر انگریزوں کو چار مختلف مقامات پر زبردست شکست دی۔ آخری جنگ میں انگریز شکست کھا کر بھاگے اور حیدر علی ان کا پیچھا کرتے ہوئے کوہ ٹھامس (مدراس شہر سے پانچ میل) پہنچ گئے۔ انگریزوں نے اس فیصلہ کن شکست سے گھبرا کر مکمل تباہی کو دعوت دینے سے پہلے حیدر علی سے صلح کی درخواست کی۔ حیدر علی نے اپنے مطلب کی شرائط پر ۱۷۶۹ء میں مدراس کے صلح نامہ پر دستخط کر دیے جس کی اہم شرط یہ تھی کہ آئندہ انگریز کبھی ریاست میسور پر حملہ نہیں کریں گے اور دونوں فریقوں میں سے کسی پر تیسری طاقت کے حملے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔۶
میسور-انگریز پہلی جنگ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بری طرح شکست کھائی تھی۔ اگر حیدر علی صلح کے بجائے مدراس پر قبضہ کر لیتے تو جنوبی ہند سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہو جاتا۔

ہندوستان کی تاریخ میں حیدر علی کا ایک خاص امتیاز ہے۔ حیدر علی نے سب سے پہلے بھانپ لیا تھا کہ انگریزوں کے سیاسی عزائم کیا ہیں۔ دیسی والیان ریاست میں وہ پہلا حکمران تھا جو ہندوستان کو یا کم از کم دکن کو فرنگی استعماریت سے بچانا چاہتا تھا۔ محمد علی والا جاہ کی خود غرض سیاست اور کج فہمی سے انگریزوں کے قدم کرناٹک میں مضبوطی سے جم گئے تھے۔ حیدر علی کرناٹک سے انگریزوں کا نام و نشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اور یہ اس کی زندگی کا نصب العین بن گیا تھا۔ اس کے باوجود پہلی جنگ

میں انگریز سامراجیت کو مکمل طور پر ختم کرنے کا موقع حاصل ہونے پر بھی حیدر علی نے مدراس پر قبضہ کرنے کے بجائے انگریزوں کو کمزور کرکے صلح کر لینا بہتر سمجھا۔ کیوں کہ حیدر علی کو مرہٹوں اور نظام کی طرف سے سخت خطرہ لاحق تھا۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے کہ حیدر علی جیسے محب الوطن شخص کو گھر کے ناپاک دشمنوں سے بچاؤ کے لیے باہر کے احسان مند مکار دشمن سے مدد کی توقع کرنی پڑی۔ اس المیے پر افسوس کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے لکھا ہے۔ ے

''حیدر علی نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینے کی پہلی منظم کوشش کی۔ انھوں نے مرہٹوں کے پاس نظام حیدرآباد کے پاس اور اودھ کے نواب کے پاس پیغامبر بھیجے۔ لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔''

میسور–انگریز دوسری جنگ: ۱۷۸۰ء تا ۱۷۸۲

میسور کی دوسری جنگ انگریزوں سے ۱۷۸۰ء میں شروع ہوئی۔ اسے پولی لور (پولیلور) کی جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے مل کر ۱۷۸۱ء میں سرہکٹر منرو (جنگ بکسر کا فاتح) اور کرنل بیلی کی مشترکہ فوج کو زبردست شکست دی۔ اس جنگ میں مرہٹے اس امید پر حیدر علی کا ساتھ دے رہے تھے کہ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کر سکتا ہے۔ ابھی جنگ جاری تھی کہ ۷ر دسمبر ۱۷۸۲ء کے دن حیدر علی کا میدان جنگ میں انتقال ہو گیا۔ حیدر علی کے انتقال سے مرہٹے بددل ہو گئے اور گھبرا کر نانا فرنویس نے انگریزوں سے دب کر صلح کر لی۔ اس طرح انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینے کا ایک اور موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

میسور–انگریز تیسری جنگ

لارڈ کارنوالس کو ۱۷۸۶ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔ یہ وہی لارڈ کارنوالس تھا جس کو امریکہ نے اپنی جنگ آزادی کے دوران شکست دی تھی۔ ۱۷۸۲ء کے بعد حکومت برطانیہ کی وزارت نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہند کو اپنے اختیار میں لے لیا۔ تاکہ دیسی والیان ریاست کی مدافعتی قوت کو کچلنے کے لیے حسب ضرورت مناسب سامان جنگ فراہم کیے جائیں۔ ۸ برطانیہ کی خارجہ پالیسی میں اس تبدیلی کی بنا پر ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت برطانیہ کے جنگی وسائل یکجا ہو گئے۔ اب تک ہندوستان کے دیسی والیان ریاست ایسٹ انڈیا کمپنی سے جنگ کر رہے تھے۔ ۱۷۸۲ء کے بعد ہندوستانیوں کو حکومت برطانیہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے جنگ کرنی پڑی۔

یعنی حیدر علی نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے جنگ کی تھی۔ لیکن ٹیپو سلطان کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت برطانیہ دونوں سے جنگ کرنی پڑی۔ اس وقت کے وزیر اعظم انگلستان مسٹر پٹ ہندوستان میں انگریزی راج قائم کر کے امریکہ کھو دینے کا داغ بدنامی دھونا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے لارڈ کارنوالس کا انتخاب کیا اور اسے خاص ہدایت دی تھی کہ وہ ہندوستان میں انگریزی راج قائم کر کے امریکہ والی شکست کا داغ بھی دھو لے۔

لارڈ کارنوالس کی نظر سب سے پہلے ٹیپو سلطان پر پڑی کیوں کہ وہی ایک ایسی آہنی دیوار تھی جس کو گرائے بغیر کارنوالس کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ ہندوستان پہنچتے ہی کارنوالس نے سب سے پہلے نواب اودھ پر بے انتہا مظالم ڈھا کر اودھ کی ساری دولت چھین لی۔ اس کے بعد کارنوالس کلکتہ سے مدراس پہنچا۔ نظام حیدرآباد اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ایک زبردست فوج کے ساتھ ریاست میسور پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں سلطان کو انگریزوں، نظام اور مرہٹوں کی مشترکہ فوج سے لڑنا پڑا۔ سلطان نے کئی مقامات پر اتحادی فوجوں کو شکست دی اور پیچھے ہٹتا ہوا سرنگا پٹنم پہنچ گیا۔ انگریزوں نے سلطان کے پائے تخت کا محاصرہ کر لیا۔ سری رنگا پٹم ایک ناقابل تسخیر قلعہ تھا۔ اتحادی فوجیں قلعہ فتح نہ کر سکے اور محاصرہ نے طول پکڑا۔ کارنوالس نے مجبور ہو کر سلطان سے صلح کر لی۔ اس صلح کے نتیجے میں سلطان کی آدھی سلطنت چھن گئی۔ تین کروڑ سے زیادہ تاوان جنگ ادا کرنا پڑا۔ تاوان جنگ کی ادائگی میں مہلت مانگی گئی تو انگریزوں نے سلطان کے بیٹوں کو بطور ضمانت طلب کیا۔ سلطان نے اپنے دو بیٹوں شہزادے عبدالخالق اور شہزادے معزالدین کو انگریزوں کے حوالے کر کے صلح کی شرائط کو پورا کیا۔ مرہٹے سلطان کے اس بے مثال ایثار سے بہت متاثر ہوئے کہ سلطان نے اپنے لخت جگر کو تاوان جنگ میں دینا قبول کیا لیکن مادر وطن کی غلامی قبول نہیں کی۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر مرہٹہ سردار نے کہہ دیا کہ سلطان سے جنگ کرنا مادر بھومی سے غداری کرنے کے برابر ہے۔ لیکن نظام علی خان فرماں روائے سلطنت آصفیہ غیرت و حمیت سے اتنا تہی دامن ہو چکا تھا کہ اس کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔ مرہٹوں نے اپنا کہا پورا کیا اور میسور کی چوتھی جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا۔

میسور-انگریز چوتھی جنگ: ۱۷۹۹ء

لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا۔ اس سے قبل سر جان شور کا دور دکن میں نسبتاً امن کا دور تھا۔ نئے گورنر جنرل کے آتے ہی میسور پر فوج کشی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ٹیپو سلطان کی آدھی حکومت چھن چکی تھی۔ اس کی سرحدیں سمندر سے دور ہو چکی تھیں۔ پھر بھی سلطان نے ہمت نہ

ہاری۔ سلطان آزادی کی جد و جہد کو ایک بین الاقوامی مسئلہ بنانا چاہتا تھا۔ سلطان کے بعد ۱۹ ویں صدی میں ہندوستان کی آزادی کو بین الاقوامی مسئلہ بنانے کا خیال جس کو آیا وہ مولانا برکت اللہ بھوپالی تھے۔ چنانچہ سلطان نے اپنے سفیر ایران، افغانستان، ترکی، فرانس اور امریکہ کو روانہ کیے تھے۔ امریکن کانگریس لائبریری میں جارج واشنگٹن کے نام سلطان کے خط کی نقل موجود ہے۔ خود امریکہ اپنی آزادی کی لڑائی فرانس کی نیوی کی مدد سے جیت سکا تھا۔ ولزلی نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان کے علاقائی رجواڑے بین الاقوامی تعلقات پیدا کر کے حکومت برطانیہ کو اپنے سامراجی عزائم پورا کرنے کے راستے میں مشکلات کھڑی کریں۔ چنانچہ سلطان کی سفارتی سرگرمیوں کو وہ ایک باغی کی ناقابل معافی حرکتوں سے تعبیر کرتا تھا۔ ولزلی ایک کٹر شاہ پرست پارلیمنٹری طرز حکومت کا مخالف اور فرانس کا سخت دشمن تھا۔ سلطان کے دربار میں فرانسیسی اثر و رسوخ اور نپولین کی مخالف برطانوی پالیسی سے خوف زدہ تھا۔ چنانچہ اس نے زیادہ انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ نظام حیدرآباد، ریاست میسور کے مشرقی اضلاع کڈپہ اور کرنول کو ہڑپ کرنے کے لیے بے چین تھا۔ مرہٹے ٹیپو سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اور نہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ لہٰذا نظام حیدر آباد کی کثیر فوج کو ساتھ لے کر ولزلی نے ۱۷۹۹ء میں میسور پر حملہ کر دیا۔ حملہ دو طرف سے کیا گیا۔ مدراس کی طرف سے جنرل ہارس اور ملیبار اور کورگ کے راستے سے جنرل اسٹوارٹ (Stuart) سرنگا پٹم کی طرف بڑھے۔ حیدرآبادی فوج میر عالم کی کمان میں جنرل ہارس کے ساتھ تھی۔ سلطان نے چند طوفانی دستے دونوں طرف روانہ کیے تاکہ انگریز فوجوں کی پیش قدمی کی رفتار کو قابو میں رکھا جائے اور اپنی بیشتر عسکری قوت کو یکجا کر کے سرنگا پٹم میں انگریزوں کا انتظار کرنے لگا۔ برسات میں دریائے کاویری کی طوفانی موجیں کسی کو سرنگا پٹم میں داخل ہونے نہیں دیتی ہیں۔ سلطان کی جنگی چال تھی کہ موسم برسات میں انگریزی فوجوں کو ایک لمبے عرصہ تک روک کر انھیں ہراساں کرے اور کاویری کے کنارے انھیں عبرت ناک شکست دے تاکہ بھاگیرتی کے کنارے انھوں نے جو کچھ حاصل کیا تھا اسے کاویری کے کنارے کھودیں۔ جو طوفانی دستے انگریزوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے روانہ کیے گئے تھے ان کے سالار پہلے سے غداروں کی ناپاک فہرست میں اپنا نام لکھوا چکے تھے۔ لہٰذا انگریزی فوجیں دونوں طرف سے بغیر کسی مزاحمت کے تیزی کے ساتھ پائے تخت پہنچ گئیں۔ سرنگا پٹم کے قلعہ کو جب انگریزی فوجوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور قلعہ پر مسلسل گولہ باری ہونے لگی تو اس وقت سلطان کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے اعلیٰ فوجی افسروں کی صف میں چند غدار افسر بھی موجود ہیں جو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال کا اندازہ ہوتے ہی سلطان نے فوجی افسروں کی میٹنگ بلائی اور اپنے شبہ کا اظہار کرتے ہوئے خاص طور پر فرانسیسی افسروں کو مخاطب کر کے فرمایا۔۹

"موجودہ حالت کو تم دیکھ رہے ہو۔ جس پر کوئی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں کو میں اپنا معتمد اور یار غار جانتا تھا، ان کی مکاری اور دغابازی کو حیرت سے دیکھ رہا ہوں اور غنیم کا زور روز بروز ہر جگہ بڑھتا جا رہا ہے اب کیا کرنا چاہیے۔"

فرانسیسی افسر موسیو چپسیو نے جواب دیا۔

"ہم نے حضرت کا نمک کھایا ہے اور حضرت نے ہمیشہ ہم پر بھروسہ کیا ہے۔ ہم حضرت کے پسینے پر اپنا خون گرانے کے لیے تیار ہیں۔ اب مصلحت وقت یہ ہے کہ حضرت قیمتی سامان لے کر مع خواتین حرم سرا کے آدھی رات کے بعد خاموشی کے ساتھ قلعہ معلی سے باہر تشریف لے جائیں۔ باہر نکل کر دس ہزار سوار جرار اور پانچ ہزار فوج باقاعدہ کا زبردست بدرقہ معہ بیس ضرب توپ کے ساتھ موہ بسرا و قلعہ چتلدرگ پر جا پہنچیں اور یہ قلعہ فدوی اور موسیو ادلی سپہ سالار کے تفویض کر جائیں۔ جب تک ہم میں سے ایک بھی باقی رہے گا حضرت کے ادائے نمک میں قصور نہ ہوگا۔ اور اگر یہ بات منظور خاطر نہ ہو تو حضرت ہم سب فرانسیسیوں کو پکڑ کر انگریزوں کے سپرد کر دیں۔ وہ ہمارے نکل جانے سے حضرت کے ساتھ مصالحت کی گفتگو کرنے لگیں گے۔ کیوں کہ ان کو زیادہ تر ہمارے ہی ساتھ کینہ و پرخاش ہے۔"

ٹیپو سلطان فرانسیسی افسر کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ تم جیسے شریف، بہادر، نمک حلال اور وفادار دوستوں کو دشمن کے حوالے کر دوں؟ اگر میری تمام سلطنت بھی مجھ سے چھن جائے تو اس پر راضی ہوں لیکن تم کو ہرگز دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ پھر سلطان نے اپنے نمک حرام وزیر میر صادق سے اس مشورہ کا ذکر کر کے اس کی رائے معلوم کرنی چاہی تو میر صادق نے کہا کہ فرانسیسی اور انگریز دونوں ایک ہیں۔ اگر یہ قلعہ ان کے سپرد کر دیا جائے تو وہ اسے انگریزوں کے حوالے کر کے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ پھر سلطان نے سرنگا پٹم چھوڑ کر چتلدرگ چلے جانے کے بارے میں دریافت کیا تو سارے امراء نے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن بدرالزماں خان ناظم نے کہا۔

"قبلۂ عالم! جیسے ہی حضرت کا مع خواتین و خزانہ و شہزادگان کے قلعہ چھوڑ کر باہر جانا معلوم ہوگا سب جاں نثاروں کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی۔ پس اس وقت یہ عمل ہرگز شایانِ ہمت شاہانہ نہیں ہو سکتا۔"

یعنی غدار امراء کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر سلطان قلعے سے باہر نکل گیا تو پھر ان کی سازش کامیاب نہ ہو سکے گی۔ بدرالزماں خان کا جواب سن کر سلطان نے حیرت سے امراء کی شرم آگین

صورتوں پر نظر ڈالی اور نہایت گہری اور ٹھنڈی سانس بھری۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر یہ الفاظ زبان سے نکالے ص ص

"رضائے مولیٰ بر ہمہ اولیٰ"

سلطان کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میسور کی چوتھی جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ تاریخ نے ایک بار پھر جنگ پلاسی کا ڈرامہ سرزمین میسور پر دھرایا۔ میر جعفر، وِلبھ رام، امی چند اور نجف خان کی روحیں میر صادق، میر معین الدین، میر قاسم، میر قمرالدین اور بدرالزماں خان کی شکل میں نمودار ہوئیں جنھوں نے اپنے ملک اور مالک دونوں سے غداری کی۔ ان کی مدد اور رہنمائی میں انگریزی فوجیں قلعے کی فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہو گئیں۔ ٹیپو سلطان نے ہتھیار ڈال کر گرفتار ہونے سے انکار کر دیا بطن فاطمہ (ٹیپو شہید کی والدہ کا نام فاطمہ تھا) سے جنم لینے والے حیدر کے سپوت نے اپنے بے شمار ہندو مسلم سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں سے لڑتے ہوئے ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو جام شہادت نوش کیا۔ ایک روایت کے مطابق ٹیپو سلطان کے باڈی گارڈ دستے میں پانچ ہزار سپاہی تھے اور سپہ سالار ایک ہندو آفیسر تھا۔ کچھ برہمن زادیاں جو ٹیپو کو اپنا باپ کہتی تھیں فوجی لباس میں ٹیپو کے ساتھ شہید ہونے والوں میں شامل تھیں۔ ٹیپو کی شہادت سرنگا پٹم کی مشہور زمانہ مسجد، مسجد اعلیٰ اور شری رنگا ناتھ سوامی کے مندر کے درمیانی میدان میں واقع ہوئی تھی۔ سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کا چراغ گل ہو گیا اور قوم اور وطن کے دشمنوں کو للکارنے والا کوئی مجاہد باقی نہ رہا تو انگریز فرط مسرت سے چلا اٹھے کہ

"آج ہندوستان ہمارا ہے۔"

ص ص: افسروں کی میٹنگ کی روداد محمود خان محمود بنگلوری صاحب نے اپنی کتاب "سلطنت خداداد" میں نشان حیدری کے حوالے سے دی ہے۔ اس کے مستند ہونے کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ ہم نے اس مکالے کا بیشتر حصہ یہاں اس لیے درج کیا ہے کہ اگر یہ حقیقت پر مبنی ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ منصوبہ اگر کامیاب ہو جاتا اور سلطان قلعہ سے باہر نکل کر میسور کے دور دراز علاقوں اور کئی ایک قلعوں میں موجود فوج کو جمع کر کے پلٹ کر انگریزوں پر حملہ کرتا تو پتہ نہیں تاریخ کا دھارا کیا رخ اختیار کرتا۔ شہزادہ فتح حیدر ولی عہد سلطنت اور ملک جہاں خان خاصی فوج لیے ہوئے کری گز کی پہاڑی کے اس پار تھے۔ سلطان کی شہادت کے بعد ملک جہاں خان اور میر مران ناصر علی نے شہزادے کی ہمت بندھائی اور کہا کہ صرف سرنگا پٹم ہاتھ سے گیا ہے۔ میسور کا وسیع ملک اور کئی مضبوط قلعے باقی ہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ جنگ جاری رکھیں۔ ظاہر ہے سلطان باہر نکل کر ان وسائل کو استعمال کر سکتا تھا۔ لیکن غداروں نے اس منصوبہ کو عملی شکل دینے سے پہلے ہی ناکام بنا دیا۔

انگریز سامراجیت کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے بنگال کی انقلاب انگیز سرزمین کے مردِ مجاہد سراج الدولہ نے ۱۷۵۷ء میں اپنے خون کی قربانی پیش کی تھی۔ اور اب بیالیس سال بعد دریائے کاویری کے کنارے سرنگا پٹم کے ناقابلِ تسخیر قلعے کی ٹوٹی ہوئی فصیل کے اندر شری رنگا ناتھ سوامی کے مندر اور مسجد اعلیٰ کے درمیانی میدان میں سلطان ٹیپو کا شہید جسد خاک و خون میں لت پت پڑا ہوا تھا۔ سلطان کی نعش کے اطراف سینکڑوں مسلمان اور ہندو سپاہیوں اور ہاڈی گارڈ دستے کے ہندو سالار کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ یہ نعشیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں یہاں ایک طرف مندر ہے اور دوسری طرف مسجد، گنگا۔ برہم پتر کے ڈیلٹا سے لے کر کاویری کی طوفان خیز موجوں تک ہم نے ہر مندر اور مسجد کو بچانے کے لیے ان گنت جانیں قربان کر دی ہیں۔ لیکن غلامی کے ذلت آمیز طوفان کو نہیں روک سکے۔ عسکری جدوجہد کا دور آج ختم ہوا۔ اے ہندوستان کے عوام کیا تم غلامی کو بخوشی قبول کر لو گے۔ اس زنجیر کے بوجھ تلے تمھاری گردن جھک جائے گی۔ اس شہید اعظم کی نعش کو دیکھ رہے ہو۔ اس نے ہمیں شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہے کا سبق پڑھایا تھا۔ تو ہم نے جان لیا تھا کہ گردن جھکانے سے بہتر باعزت زندگی کی آرزو میں کٹ جانا ہے۔ سو ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ اس آواز کی گونج سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ پھر گنگا جمنا کے دوآبے سے وہ عوامی طوفان اٹھا جس کی نظیر تاریخ عالم میں بہت کم ملے گی۔ وہ طوفان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا پیش خیمہ تھا۔

مرہٹوں کا زوال

ٹیپو سلطان کے بعد مرہٹے ایک قوت رہ گئے تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس ملک گیری پر بند باندھ سکتے تھے۔ لیکن مرہٹوں کا زوال خود ان کی باہمی خانہ جنگیوں کے باعث ہوا۔ تاریخ میں ایک ایسا موڑ آیا تھا جب مادھو راؤ سندھیا نے شاہ عالم کو الہ آباد سے انگریزوں کی پناہ سے نکال کر دہلی لے آئے اور تخت سلطنت پر بیٹھا کر ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔ شاہ عالم نے اس خدمت اور ان کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے اپنا منہ بولا بیٹا تسلیم کر کے سندھیا کو وکیلِ مطلق کا عہدہ عطا کیا تھا۔ جس میں وزیر اعظم اور سپہ سالار کے عہدے شامل تھے۔ لیکن مرہٹہ سرداروں کی آپس میں خانہ جنگی کی وجہ سے سندھیا کو اتنا وقت ہی نہ مل سکا کہ وہ دہلی میں مستقل قیام کر کے مغل سلطنت کے الجھے ہوئے معاملات کو ٹھیک کر کے اُسے ایک ناقابلِ تسخیر قوت میں بدل دیتے۔ چنانچہ مرہٹہ سردار جنگ و جدل میں الجھے رہے اور کمپنی بہادر بنگال سے لے کر دکن تک اپنے اقتدار کو مستحکم کرتی رہی۔ گورنر جنرل کے عہدے کا چارج لینے کے فوراً بعد ولزلی نے مرہٹوں سے گفت و شنید شروع کی اور انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے باج گزار حلیف بننے کی دعوت دی۔ پیشوا نے اس پیش کش کو

ٹھکرا دیا۔ لیکن جب یشونت راؤ ہولکر نے انھیں ۱۸۰۲ء میں شکست دے کر پونا سے نکال دیا تو مجبوراً پیشوا نے انگریزوں کی سرپرستی قبول کرلی اور صلح نامہ پر دستخط کر کے اقتدار سے دست بردار ہو گئے۔ اس طرح مرہٹوں کی مرکزی حکومت کا وجود ختم ہو گیا۔ مرکزی حکومت کو ختم کر کے دیگر مرہٹہ سرداروں کی طرف متوجہ ہوا پہلے جنرل لیک نے سندھیا کی فوجوں کو علی گڑھ کے مقام پر تہس نہس کر دیا۔ بعد ازاں سندھیا اور بھونسلہ کی فوجوں کو بالترتیب آسے اور آرگاؤں کے مقامات پر بری طرح شکست دی گئی۔ اس شکست کے بعد سندھیا اور بھونسلے دونوں نے اپنی آزادی سے دست برداری کے معاہدات پر دستخط کر کے اقتدار کمپنی بہادر کے حوالے کر دیا اور وظیفہ پر قناعت کر لی۔ اس طرح مرہٹوں کا سیاسی زوال مکمل ہو گیا۔[۱۰]

عوامی بغاوتیں پس منظر: ۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۶ء

میسور کی آزادی ختم کرنے کے بعد اور مرہٹہ قوت کو پوری طرح برباد کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۵۰ سال کے اندر یعنی ۱۸۵۰ء تک ہندوستان کی علاقائی ریاستوں کے علاوہ لگ بھگ پچیس ہزار جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کی املاک کو ضبط کر کے انگریزی راج میں شامل کر لیا۔ جس جس علاقے کا الحاق انگریز کرتے گئے وہاں کی بے اندازہ دولت لوٹ لی گئی، شہر ویراں ہو گئے، زراعت، صنعت اور تجارت تباہ ہو گئی۔ صنعت اور تجارت کی بربادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ روزی روزگار کے لیے زراعت کی طرف متوجہ ہوتے گئے۔ لیکن انگریزوں نے پہلے سے بڑے بڑے زمینداروں کو زمینات سے بے دخل کر کے ان پر چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو مقرر کر دیا تھا اور ان پر براہِ راست زبردست محصول عاید کر دیا تھا۔ چھوٹے کاشتکاروں سے جو لوٹ کی دولت حاصل کی گئی تھی اسے زرعی ترقی اور کسانوں کی امداد میں لگانے کے بجائے ہندوستان میں لڑی گئی جنگوں کے مصارف اور برطانیہ کی صنعتی ترقی میں جھونک دی گئی۔ اس طرح ہندوستانی زراعت کو ترقی کرنے اور ملکی ضروریات کے مطابق آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ ۱۷۵۷ء سے ۱۸۱۸ء تک کمپنی بہادر نے ہندوستان میں ۲۰ عظیم جنگیں لڑی تھیں جس کا سارا خرچ ہندوستان کی زمینوں کے محصول سے ادا کیا گیا۔[۱۱] اس کے علاوہ جو دولت ہندوستان کے رجواڑوں اور نوابوں سے زبردستی چھین لی گئی تھی وہ راست طور پر کمپنی کے انگریز ملازمین خصوصاً فوجی سربراہوں کے جیب میں چلی گئی۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو مجبور کر کے زرخیز زمینوں پر زندگی کے بنیادی ضروریات کے اناج جیسے چاول، جوار، مکئی، گیہوں اور دالیں وغیرہ اُگانے کے بجائے کیش کراپ جیسے پٹ سن، کاٹن، مرچ، دھنیاں اور افیون (opium) وغیرہ اُگانے کا

رواج پاتا۔ اس لوٹ کھسوٹ اور غلط پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی ہند ۱۸۳۷ء میں ہولناک قحط کا شکار ہو گیا۔ اس قحط کے دوران ایک اندازے کے مطابق بنگال اور بہار میں کم از کم آٹھ لاکھ انسان موت کا نوالہ بن گئے۔[12]

۱۸۳۰ء میں کمپنی نے اعلان کیا کہ سرکاری دفاتر میں انگریزی زبان رائج کی جائے گی۔ اس وقت تک مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے برادرانِ وطن خاص طور پر ہندو طبقہ تیزی سے انگریزی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کلکتہ میں پہلا انگریزی کالج ۱۸۱۶ء میں اینگلو انڈین کالج کے نام سے قائم کیا گیا۔ ۱۸۱۸ء میں پادری کیری نے بنارس میں عیسائی کالج جے نارائن کالج کے نام سے قائم کیا تھا۔ پونہ میں ۱۸۳۱ء میں ہندو کالج اور ۱۸۲۳ء میں آگرہ کالج قائم ہوا۔ انگریزی تعلیم کے نتیجے میں ہندو طبقے نے حکومت کے تمام شعبوں پر قبضہ کر لیا اور مسلمان بہت پیچھے رہ گئے۔ ان میں بے روزگاری بڑھ گئی۔ انگریزی تعلیم کے نتیجے میں جہاں ہندو طبقے نے معاشی مفادات حاصل کیے وہیں ان میں مذہبی حوالے سے غیر معمولی تبدیلی کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ لارڈ میکالے کے ایک خط سے جو انھوں نے اپنے والد کے نام لکھا تھا اس کا اظہار ہوتا ہے۔[13] ''اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے تحت ہندو رہتے ہیں۔ مگر بہت سے یا تو ملحد ہو جاتے ہیں یا عیسائی مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عمل درآمد ہوا تو پچیس، تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہیں رہے گا۔''

صرف انگریزی تعلیم ہی نہیں ۱۸۳۳ء کے بعد سے یورپ سے پادریوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان پادریوں نے مذہبی تبلیغ کے جنون میں ہندوستان کے مذاہب پر بے جا حملے کر کے اہلِ ہند کی دل آزاری کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ وہ حالات تھے جس کی وجہ سے مسلمان سب سے پہلے بیدار ہوئے۔ ہندوستان میں مسلم عوام اور خواص کا ایک خاص طرزِ عمل رہا ہے۔ مسلم علماء جو شریعت کے پاسباں رہے ہیں انھیں کبھی یہ فکر نہیں ہوئی کہ ان کا بادشاہ کس قوم و مذہب کا شخص ہے۔ البتہ حکومتِ وقت نے جب بھی مسلمانوں کے مذہب کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے تو نہ صرف علماء بلکہ عوام الناس بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب اکبر اعظم نے اسلام اور ہندو مذہب کو مسخ کر کے اور دونوں کے ملاپ اور کچھ اپنے ذاتی عقیدے کو بنیاد بنا کر دینِ الٰہی نامی نئے مذہبی طریقہ کار کا اعلان کیا تو اس دور کے علماء نے فتویٰ دیا تھا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کرنا جائز ہے۔ اس

کے برخلاف جب مرہٹوں نے انیسویں صدی کے شروع میں مغل سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ملک کو تاخت وتاراج کیا اور بیشتر علاقوں پر سوراج قائم کر کے رعایا سے چوتھ وصول کرنا شروع کیا تو علماء سے پوچھا گیا تھا کہ مسلمانوں کا ملک کفار کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے جو مسلمانوں کو نماز جمعہ اور عیدین ادا کرنے دیتے ہیں اور شریعت اسلام قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں کی خواہش کے مطابق قاضی مقرر کرتے ہیں۔ مگر مسلمان حاکم مقرر کرانے کے لیے مسلمانوں کو کفار سے درخواست کرنی پڑتی ہے۔ ایسا ملک دارالاسلام ہے یا دارالحرب۔"[۱۴] تو علمائے جون پور نے فتویٰ دیا تھا کہ "ایسا ملک دارالاسلام ہے اور ایسے حاکم یعنی مرہٹوں سے بغاوت جائز نہیں ہے۔" اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے پیش نظر صرف یہ امر رہا ہے کہ انھیں شریعت پر عمل کرنے کی آزادی حاصل رہے۔ خواہ عملداری مسلمان بادشاہ کی ہو یا غیر مسلم کی۔

لیکن برٹش انڈیا میں مسلمانوں نے سب سے پہلے بھانپ لیا کہ عوام کی معاشی، اقتصادی، تعلیمی اور مذہبی خودمختاری چھینی جارہی ہے۔ جب تک ایسٹ انڈیا کمپنی سیاسی غلبہ حاصل کرنے میں مصروف رہی عوام اور علماء نے خطرہ محسوس نہیں کیا۔ لیکن جب حالات نے یہ رخ اختیار کیا تو علماء بیدار ہوئے اور عوام کی رہنمائی کی ذمہ داری سنبھال لی۔ پھر ایسی عوامی جدوجہد شروع ہوئی جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا پیش خیمہ تھی۔ انگریزوں کے نفرت سے بھرپور ظالمانہ کارناموں اور وحشیانہ سرگرمیوں نے ہندوستانی عوام خاص طور پر علماء میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ علماء یہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ، صوبوں کے نواب اور فوجی سربراہ غیر ملکی گوروں کا خاتمہ کردیں گے۔ مگر پلاسی، بکسر، روہیلکھنڈ، میسور، دکن اور وسط ہند کی لڑائیوں میں ناکامی نے مایوسی کی کیفیت پیدا کردی۔ ٹھیک تاریخ کے اُسی موڑ پر ہندوستان کا ایک عالم اٹھا اور انگریزوں کے خلاف پہلا جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ شاہ عبدالعزیز فرزند شاہ ولی اللہ نے اعلان کیا کہ "اسلام کی بنیادیں یقیناً ڈھادی گئی ہیں۔ کیوں کہ آزادیٔ ضمیر آزادیٔ رائے اور شہری آزادی سے اپنائے ملک کو محروم کردیا گیا ہے لہٰذا ہر محب وطن کا فرض ہے کہ اس اجنبی طاقت کے خلاف اعلان جنگ کردے۔"[۱۵] اس کے بعد شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحی نے ایک خاص مذہبی فرمان جاری کیا جو کچھ یوں تھا۔ دہلی سے کلکتہ تک انگریزوں کے خلاف جنگ کرنا خدائی فیصلہ ہے۔ ان دو اعلانات کا ذکر ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں "ہندوستانی مسلمانوں نے انگریزوں کی طرف سے آنے والی تبدیلی کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا اور ان کی رہنمائی دو عالموں نے ان دو فرمانوں سے کی تھی۔"[۱۶] مسلمان علماء نے کس چیز کو بھانپ لیا تھا اسے جاننے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں انگلستان کی پارلیمنٹ کے سامنے جو بیان دیا تھا وہ

کافی ہے۔ "خدا نے ہندوستان کی یہ عظیم الشان سلطنت انگلستان کو اس لیے سونپی ہے کہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حضرت عیسیٰ مسیح کی فتح کا پرچم لہرانے لگے۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنی پوری طاقت اس کام میں لگا دینی چاہیے کہ سارے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے اعلیٰ مقصد کو پورا کرنے میں ملک بھر کے اندر کہیں پر کسی وجہ سے ذرا بھی ڈھیل نہ آنے پائے۔" [۱۶]

عیسائیت کی تبلیغ میں انگریز اس قدر دیوانے ہو گئے تھے کہ پنڈت سندر لال صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں۔ "جہاں جہاں انگریز حکومت قائم ہوتی جاتی تھی وہاں وہاں بے شمار پرانے مندروں اور مسجدوں کی مغلیہ حکومت کی طرف سے دی گئیں معافی کی جاگیریں چھین لی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہندو اور مسلمان قیدیوں کے لیے جیل خانوں میں بھی اپنے اپنے مذہب کے مطابق رہ سکنا ناممکن کر دیا گیا۔ عیسائی پادری عام طور پر اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہندو اور مسلمان مذہبوں کی سخت برائی کرنے لگے۔ دونوں مذاہب کی پاک بزرگ ہستیوں کے لیے نازیبا الفاظ کا استعمال کرنے لگے۔" [۱۷]

اٹھارہویں صدی میں صرف مغلیہ سلطنت کا سیاسی زوال ہی نہیں ہوا بلکہ عام مسلم معاشرہ دینی، اخلاقی اور سماجی اعتبار سے ایک زوال پذیر معاشرہ تھا۔ اس معاشرے میں شرافت ونجابت کا تعلق خون کے رشتہ سے وابستہ تھا۔ ذات پات کی بندشیں جو ہندو معاشرے میں ہمیشہ سے مذہبی اہمیت کی حامل رہی ہیں وہی صورت مسلمانوں کی عملی زندگی میں بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس معاشرے میں توہمات اور رسم پرستی نے اصل مذہب کی جگہ لے لی تھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخ ادب اردو میں اس معاشرے کی تصور کشی ان الفاظ میں کی ہے۔ "بہادری، شجاعت اور عسکریت کے عناصر ضائع ہو چکے ہیں۔ عدم تحفظ کے احساس نے معاشرے کو بے عمل ومفلوج کر دیا ہے۔ اسی لیے یہ معاشرہ وہ راستہ اختیار کرتا ہے جس پر چل کر اس پر آشوب زمانے کو وقتی طور پر بھلا سکے۔ اس خود فراموشی کے لیے وہ ایک طرف شراب پر تکیہ کرتا ہے، میلے ٹھیلوں، عرس، چراغاں، گانے بجانے اور عیش کوشی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اور دوسری طرف تلاش سکون میں تصوف اور پیری مریدی کا سہارا لیتا ہے۔ بادشاہ سے لے کر عوام تک سب یہی کر رہے ہیں۔ اس معاشرے نے بزم آرائی، صہبا پرستی اور عیش کوشی کو تصوف سے ملا کر اسے بھی اپنے لیے مفید مطلب بنا لیا ہے۔ یہ معاشرہ محویت کا شکار ہے۔ اس کی شخصیت اور تہذیبی وحدت دو ٹکڑے ہو گئی ہے۔ عورت اور مرد دونوں اسے محبوب ہیں۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اس کے مشاغل میں وہ روح نہیں ہے جس سے معاشرہ آگے بڑھتا ہے۔ اس کے سامنے نہ کوئی جہت ہے اور نہ عظیم اجتماعی مقاصد۔ قوم وملک کی فلاح وترقی کا تصور فرد کے ذہن سے معدوم ہو چکا ہے۔ اسی لیے اس صدی

میں ہمیں سورما اور بہادر نظر نہیں آتے بلکہ ان کی جگہ سازشی، سٹلے، بانکے، رنڈی بھڑوے اور خواجہ سرا ملتے ہیں جنھوں نے سرکار دربار پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ معاشی حالات ابتر ہیں، خزانہ خالی ہے۔ تجارت بحران کا شکار ہے۔ دستکار اور کاریگر پریشان حال ہیں۔ کسان کے لیے پیٹ پالنا اور محصول ادا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ ملک کی دولت غیر مفید اور غیر پیداواری کاموں پر صرف ہو رہی ہے۔" ۱۸؎ اس مایوسی اور دل شکستگی کی فضا میں تجدید اسلام اور احیائے علوم کی بنیاد رکھنے والی ہستی ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ وہ دہلی میں ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور اپنی زبان اور قلم سے دو اہم کام کیے۔ ۱) مسلمانوں کو ان کے حقیقی اعتقادی ورثے کی طرف لوٹایا ۔ ۲) حکومت کی غلط کاریوں پر نکتہ چینی کی اور اس کی درستگی کا پروگرام پیش کیا۔ شاہ صاحب پہلے ہندوستانی مفکر ہیں جنھوں نے ہندوستان کے دانشوروں کو اقتصادی انقلاب کا راستہ دکھایا۔ ڈاکٹر تارا چند نے شاہ صاحب کے کام کی قدر و قیمت کا یوں اعتراف کیا ہے۔ "سیاست کے میدان میں غالباً وہ واحد مسلم مفکر تھے جو اس امر پر صاف دماغ رکھتے تھے کہ اخلاق، سیاست اور اقتصادیات میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔ معاشرتی اخلاقیات میں وہ عدل کو سب سے اونچا مقام دیتے ہیں جو ہمارے ذاتی کردار میں مہذب برتاؤ، خوش خلقی اور آداب گفتار کی صورت نمایاں ہوتا ہے، جو مالی معاملات میں دیانت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں شہری آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کو جنم دیتا ہے۔ اور جب یہ صفت مساوات انسانی، باہمی محبت اور انسانی برادری کی بنیاد بن جاتی ہے تو معاشرتی نیکی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جب انسان عدل اختیار کرتے ہیں تو وہ ایک نیک کردار سوسائٹی کی تعمیر کرتے ہیں جو عین مرضی الٰہی ہے۔" ۱۹؎

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستانی عوام کو اُن کے بنیادی حقوق سے محروم کر رہی تھی۔ شہری آزادی، دین و مذہب پر چلنے کی آزادی، معاشرتی نیکی کو برتنے کی آزادی اور مالی معاملات میں دیانت داری کے رویے کو برقرار رکھنے کی آزادی۔ سوسائٹی کے نیک کردار انسانوں کو تنگ کیا جا رہا تھا۔ سٹلے اور موقعہ پرستوں کی سرپرستی کی جا رہی تھی۔ تو پھر وہی گھرانہ جس کے سارے افراد اس اصلاحی تحریک کو آگے بڑھا رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز شاہ ولی اللہ کے سب سے بڑے فرزند تھے۔

انیسویں صدی کے نصف اول کا یہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی تاریخ کا منظر نامہ ہے جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے تصور کو پروان چڑھایا۔ قبل اس کے کہ ہم جنگ آزادی کے عسکری پہلو کا جائزہ لیں۔ تاریخ کے چند چیدہ چیدہ واقعات کا ذکر ضروری ہے۔ علماء میں بزور شمشیر آزادی حاصل کرنے کا کام سب سے پہلے سید احمد شہید نے شروع کیا۔ سید صاحب ۱۷۸۶ء میں

بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ دہلی چلے آئے اور شاہ عبدالعزیز کی شاگردی اختیار کر لی۔ شاہ ولی اللہ کے پوتے سید اسماعیل شہید اور شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحئی سید احمد شہید کے ساتھ ہو گئے۔ سید احمد شہید نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کر کے ۱۸۲۴ء میں بریلی سے نکلے۔ سکھوں کے خلاف جہاد کا فیصلہ اس لیے کیا گیا تھا کہ سکھ انگریزوں سے معاہدہ کر کے پنجاب میں انگریز نواز حکومت تشکیل دے چکے تھے اور وہاں مسلم اکثریت پر وہی مظالم توڑ رہے تھے جو سرکار انگریزی اپنی عملداری میں روا رکھی ہوئی تھی۔ مجاہدین کی جماعت بہاولپور، حیدر آباد (سندھ) شکار پور، درہ بولان، قندھار اور کابل سے ہوتی ہوئی خیبر کے راستے پشاور پہنچ گئی اور شہر پر قبضہ کر کے ۱۸۲۷ء میں آزاد فلاحی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ مقامی پٹھان جن کی معاشرتی زندگی قبائلی عصبیت کی بنیاد پر استوار ہوئی تھی ایک دستوری مرکزی اور فلاحی حکومت کا ساتھ نہ دے پائے۔ بہت سوں نے سید صاحب کا ساتھ نہیں دیا اور کچھ تو سکھوں کے حلیف بن کر سید صاحب کے خلاف ہو گئے۔ چناں چہ یہ تحریک ۱۸۳۱ء میں سید احمد اور سید اسماعیل کی شہادت کے بعد بکھر گئی۔ لیکن تحریک مری نہیں ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۷ء تک بے شمار مجاہدین نے اپنی جان و مال کی قربانی دے کر اس تحریک کو زندہ رکھا۔ سکھوں کی خالصہ حکومت سید احمد کی شہادت کے چند سال بعد ختم ہوئی اور انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کر لیا۔ تحریک مجاہدین تقریباً ''نصف صدی'' تک کمپنی بہادر کے لیے وبال جان بنی رہی۔[۲۰] اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۲۴ء کی تحریک مجاہدین ہی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی علم بردار رہی۔ کیوں کہ جنگ آزادی کے رہنماؤں میں جو ممتاز افراد تھے وہ تحریک مجاہدین کے تربیت یافتہ اور اس کے حلقۂ اثر کے لوگ تھے۔ اس تحریک کے احیاء اس کے عروج اور زوال کے بعد بھی انگریزوں نے نہایت چالاکی سے اس تحریک کے رہنماؤں پر وہابیت کا الزام لگایا ہے۔ اس وقت وہابیت اور لفظ وہابی شرق وسطیٰ، افریقہ، ایران، افغانستان اور سرحدی علاقے میں نفرت انگیز اثرات کا حامل تھا۔[۲۱] انگریزوں نے تحریک مجاہدین اور اس کے حلقۂ اثر کے وہ لوگ جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں رہنمائی کا کام کر رہے تھے ان پر بھی وہابیت کا الزام لگا کر نادار مسلم عوام کو ان سے برگشتہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ چناں چہ ہمارے مورخین نے اس الزام کا تجزیہ کر کے صحیح رائے پر پہنچنے کے بجائے سرے سے انکار کیا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں وہابی علماء نے شرکت نہیں کی۔ پھر اس بنیاد پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ جنگ آزادی میں علماء ہند کا کوئی اہم رول نہیں تھا۔[۲۲]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پس منظر کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں ان چھوٹی چھوٹی عوامی عسکری تحریکوں پر نظر ڈالنی چاہیے جو انیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سالوں کے دوران رونما ہوئیں۔

۱۔ ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر کے بعد ہر سال صوبہ بہار و بنگال میں ہندو سپاہیوں اور مسلمان فقیروں کی مذہبی انجمنیں بغاوت کرواتی تھیں۔ انھوں نے کئی بار پورے جنگی قواعد سے انگریزی فوجوں سے مقابلہ کیا۔۴۲

۲۔ میسور کی چوتھی جنگ ۱۷۹۹ء کے بعد مالا بار کے مسلمان جاگیردار اور ہندو راجے چھ سال تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔ مالا بار کے علاقے میں ۱۸۱۲ء تک ان شورشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ٹیپو کا ایک مرہٹہ سپاہ سالار دھونڈیا واگ جس کو سلطان نے ملک جہاں خان کا خطاب دے کر اپنی فوج میں سالار مقرر کیا تھا ایک سال تک مسلسل انگریزوں سے جنگ کرتا رہا۔ ۱۸۰۰ء میں ایک لڑائی کے دوران وہ شہید ہو گیا۔ انگریز واقعہ نگاروں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر وہ مارا نہ جاتا تو دوسرا حیدر علی ثابت ہوتا۔۴۲

۳۔ ۱۸۱۶ء میں کاٹھیاواڑ، کچھ اور بڑودہ میں بغاوت ہوئی۔ وہاں کے جاگیردار راؤ بھرمل کے پاس عرب سپاہی تھے جو انگریزوں سے مسلسل کئی سال تک لڑتے رہے۔ ۱۸۱۹ء میں خاندیس کے بھیل قبیلے نے بغاوت کر دی۔۴۲

۴۔ آسام میں ۱۸۳۰ء تک اور اڑیسہ میں ۱۸۴۹ء تک مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں۔ ٹراونکور میں ۱۸۰۴ء میں بغاوت ہوئی جس کا سبب ریاست کے اندرونی معاملات میں کمپنی کی بے جا دخل اندازی کہا جاتا ہے۔ یہاں کے دیوان ویلو تامپی نے ۱۸۰۸ء میں فوج جمع کر کے انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا۔ ۱۸۱۶ء میں بریلی میں ایک خوں ریز بغاوت ہوئی جس میں ایک مقامی مقتدر عالم مفتی محمد عیوض نے خود فوجی بغاوت میں حصہ لیا اور سخت زخمی ہوئے۔۴۲

۵۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد سردار شام سنگھ نے انگریزی فوجوں پر حملہ کیا اور لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں کام آئے۔ ۱۸۴۹ء میں شیر سنگھ اٹاری اور مول راج نے مل کر بغاوت کی اور کمانڈر اینڈرسن کو قتل کر دیا۔۴۲

۶۔ ۱۸۰۰ء میں نظام حیدر آباد نے انگریزوں کے حق میں معاہدۂ غلامی پر دستخط کر دیے تو راجہ مہی پت رام (یہ سکندر جاہ نظام سوم کے فوجی مشیر تھے) نے اس معاہدے کے خلاف حیدر آباد کے اندر اور باہر وطن دوست طاقتوں کو منظم کیا اور انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی دھن میں اپنی جان کی قربانی پیش کی۔ مہی پت رام کے بعد شہزادہ مبارز

زالدولہ (نواب سکندر جاہ کے فرزند) نے سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کا ساتھ دیا۔ مہاراجہ جودھپور، راجہ ستارہ، مہاراجہ پٹیالہ، نواب بھوپال، نواب باندہ اور نواب کرنول کو پیغامات روانہ کیے اور ان کی مدد سے انگریزوں پر فوج کشی کا پلان بنایا۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں کو اس اسکیم کا پتہ چل گیا۔ انگریزی فوج نے مبارز الدولہ کے مکان پر حملہ کر دیا۔ نواب سکندر جاہ انگریزی فوج کی پیش قدمی کو نہیں روک سکے۔ دو روز کی مسلسل گولہ باری کے بعد انگریزی فوج مبارز الدولہ کے مکان میں داخل ہو کر انھیں گرفتار کر لیا اور ساری عمر جیل میں رکھا۔[۴۲]

۷۔ ۱۸۴۰ء میں ایک برہمن نرسمہ دتاتریہ کی رہنمائی میں نظام حیدرآباد کی عرب فوج نے قلعہ بادامی (ضلع وزاگا پٹم میں واقع ہے) پر قبضہ کر کے نرسمہ دتاتریہ کی حکومت کا اعلان کیا۔ اسی سال دکھنی علاقوں کے پالیگاروں نے مختلف مقامات مثلاً بیلاری، کڑپہ، اننت پور اور کرنول وغیرہ میں اتنی زبردست بغاوتیں کیں کہ انگریز مورخوں نے بھی ان کو آزادی کی خاطر دفاعی جنگ کرنے پر خراج تحسین ادا کیا۔[۴۳]

۸۔ ۱۸۰۶ء کی ویلور بغاوت خاص طور پر اہم ہے۔ ویلور جو مدراس میں واقع ہے وہاں سلطان ٹیپو کے خاندان کو نظر بند کیا گیا تھا۔ بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر اس خاندان کو کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔ بغاوت کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔ سلطان کے خاندان کی موجودگی سے وہاں کی انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں کے جذبات مشتعل ہو رہے تھے۔ اور باقاعدہ منظم کوشش کے ذریعہ بغاوت کی تیاریاں کی گئیں تھیں۔ اس لیے اس بغاوت کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ریہرسل کہا جاتا ہے۔[۴۴]

جنگ آزادی کے پس منظر کے سلسلے میں ہم نے ان عوامل اور محرکات کی نشاندہی کی ہے جن کی بنا پر انگریزی فوج کے دیسی سپاہی، ہندوستانی عوام اور ان کے رہنما ہتھیار اٹھا لینے پر مجبور ہوئے۔ ان اسباب میں ایک اہم عنصر جس کا ذکر کیے بغیر منظر نامہ مکمل نہیں ہوگا وہ ہے انگریزوں کا حد سے بڑھا ہوا احساس برتری کا تصور اس جذبے کے تحت انگریزوں نے انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں، سول حکام، مغل بادشاہوں، دیسی ریاستوں اور عوام کے ساتھ نہایت ذلت آمیز برتاؤ روا رکھا۔

انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں کے ساتھ نہایت ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا۔ معمولی بات پر ہول ناک سزا دی جاتی تھی۔ جنگ میں زخمی سپاہیوں کو ہسپتال بھیجنے کے بجائے گولی مار دی جاتی تھی۔ جنگ مکسر کے بعد سپاہیوں نے انعام اور تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا تو چوبیس سپاہیوں اور چار

افسروں کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ جنگ برما کے موقعے پر جب سپاہ نے مہنگائی الاؤنس مانگا کیوں کہ رنگون میں مہنگائی زیادہ تھی تو کلکتے سے گورہ فوج نے بارک پور آ کر ہندوستانی سپاہیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا۔ اس طرح کے سینکڑوں واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔[۲۵]

مغل بادشاہ ہندوستانی عوام میں صدیوں کی روایات کی بنا پر قابل عزت مانے جاتے تھے۔ انگریزوں نے طاقت کے نشے میں مغل بادشاہوں کے ساتھ نہایت ذلت آمیز برتاؤ کرنا شروع کیا۔ خاص طور پر شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ اور ان کے پورے خاندان کے ساتھ شاہی آداب کو بالائے طاق رکھ کر رسمی عزت اور احترام کا برتاؤ ترک کر دیا گیا۔ انگریزوں کے اس رویے سے ہندوستانی عوام اور خواص میں کمپنی بہادر کے خلاف سخت نفرت کے جذبات پیدا ہوئے۔[۲۵]

۱۸۵۶ء تک انگریزوں نے تقریباً ساری دیسی ریاستوں کے اختیارات کو محدود کر کے والیان ریاستوں کو قریب بے دست و پا کر دیا۔ بیشتر ریاستیوں کو ذرا دھمکا کر اور بعض ریاستوں کے خلاف فوجی کارروائی کر کے ان کے خزانوں پر قبضہ کر لیا۔ محلات میں گھس کر نوابوں اور راجاؤں کی ذاتی دولت لوٹ لی گئی۔ حرم سراؤں کی عورتوں کو ذلیل کیا گیا۔ ۱۸۴۹ء میں ڈلہوزی نے فوجی کارروائی کر کے رنجیت سنگھ کے پنجاب کا الحاق کر لیا۔ راجہ کی جاگیر حتیٰ کہ محل کے تمام زیورات پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان زیوارت میں کوہ نور ہیرا بھی شامل تھا۔ ۱۸۵۶ء میں ریاست اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے ریاست کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اودھ پر انگریزی تسلط سے ہزاروں لوگ جو ریاست کے مختلف محکموں میں کام کرتے تھے۔ بے روزگار ہو گئے۔ ریاست کی فوج کے ستر ہزار سپاہی فوج سے نکال دیے گئے۔ ان ستر ہزار سپاہیوں میں ۲۵ ہزار برہمن سپاہی تھے جو بے روزگار ہو گئے۔ اودھ کے جاگیردار اور زمین دار جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی اپنی زمینیں کھو بیٹھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اودھ کے ۳۵ ہزار زمین داروں میں سے ۲۱ ہزار کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ انگریزوں کے ہاتھوں ریاست اودھ کی ضبطی کا اتنا زبردست اثر پڑا کہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ اب کون محفوظ رہ سکتا ہے۔ اگر انگریز سرکار اودھ جیسے وفادار دوست کی حکومت چھین لی ہے تو پھر انگریزوں کے ساتھ وفاداری کرنے سے کیا فائدہ۔"[۲۵]

حوالہ جات

۱۔ اس گھر کو آگ لگ گئی صفحہ ۱۰: سید عاشور کاظمی اور سلیم قریشی: مطبوعہ: انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی۔ اشاعت اول: ۱۹۹۳ء

۲۔ جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون: صفحہ ۴۰: خورشید مصطفے رضوی: مطبوعہ: الجمعیۃ پریس دہلی۔ طبع اول اپریل ۱۹۵۹ء

۳۔ ایضاً: صفحہ ۴۳

۴۔ تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول: صفحہ ۳۲۰، ڈاکٹر تاراچند (مترجم: قاضی محمد عدیل عباسی) مطبوعہ: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی: پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء

۵۔ ایضاً صفحہ ۳۲۰

۶۔ حیدر علی: صفحہ ۱۱۸: نریندر کرشن سنہا (مترجم: اقتدار حسین صدیقی): مطبوعہ: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء

۷۔ ڈسکوری آف انڈیا: صفحہ ۲۷۵: جواہر لال نہرو: مطبوعہ: جواہر لال نہرو میموریل فنڈ تین مورتی ہاؤس، نئی دہلی، بیسویں انگریزی اشاعت ۱۹۹۹ء

۸۔ حیدر علی: صفحہ ۳۰۶، نریندر کرشن سنہا (مترجم: اقتدار حسین صدیقی): مطبوعہ: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء

۹۔ سلطنت خداداد: صفحات ۳۱۴ تا ۳۱۷: محمود خان بنگلوری، مطبوعہ: ہمالیہ بک ہاؤس، گلی چاندنی والی، دہلی۔ ۶، فروری ۱۹۸۳ء

۱۰۔ تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول، صفحہ ۱۰۲۔ ڈاکٹر تاراچند (مترجم: قاضی محمد عدیل عباسی): مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی: پہلا ایڈیشن ۱۹۸۰ء

۱۱۔ جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون: صفحہ ۸۱، خورشید مصطفے رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی، طبع اول اپریل ۱۹۵۹ء

۱۲۔ تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول صفحات: ۲۲۹، ۲۳۵ اور ۳۶۰: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) مطبوعہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔ طبع اول ۱۹۹۰ء

۱۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل: صفحہ ۱۴۹: سید طفیل احمد منگلوری (علیگ): ناشر محمد سمیع اللہ قاسمی، کتب خانہ عزیزیہ دہلی: پانچواں ایڈیشن ۱۹۴۵ء

۱۴۔ ایضاً: صفحہ ۱۶۷

۱۵۔ تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول صفحہ ۲۶۱: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی عدیل عباسی) مطبوعہ: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی: طبع اول ۱۹۹۰ء

۱۶۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان، صفحہ ۱۳۵: ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (مترجم ڈاکٹر صادق حسین): مطبوعہ: الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵۔ جون ۲۰۰۲ء

۱۷۔ آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی: صفحہ ۳۶، غلام حیدر: مطبوعہ نیو ڈیر آرٹ پرنٹرس، نئی دہلی ۔ مارچ ۱۹۸۷ء

۱۸۔ تاریخ ادب اردو جلد دوم، حصہ اول: صفحہ ۱۱۴ اور ۱۱۵: ڈاکٹر جمیل جالبی: مطبوعہ: مجلس ترقی ادب، لاہور طبع اول جون ۱۹۸۲ء

۱۹۔ تاریخ تحریک آزادی ہند: جلد اول: صفحہ ۲۶۰: ڈاکٹر تاراچند (مترجم قاضی محمد عدیل عباسی) مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی: طبع اول ۱۹۹۰ء

۲۰۔ علماء ہند کا شاندار ماضی: جلد ۲، ہندوستانی مسلمان اور تحریک آزادی: صفحہ ۲۵۶: مولانا محمد میاں، مطبوعہ: الجمعیۃ پریس دہلی، ۲۶/جولائی ۱۹۵۷ء

۲۱۔ ایضاً: صفحہ ۲۳۵

۲۲۔ جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون: صفحات ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸ اور ۱۳۹: خورشید مصطفیٰ رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی، طبع اول ۱۹۵۹ء، (ناشر مکتبہ برہان اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۔ ۶

۲۳۔ سید بادشاہ کا قافلہ: صفحہ ۱۱۵، آبادشاہ پوری، مطبوعہ: مکتبہ ذکری رامپور یوپی، باراول، اگست ۱۹۸۲ء،

۲۴۔ جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون: صفحات: ۱۴۰، اور ۱۴۲: خورشید مصطفیٰ رضوی: مطبوعہ: الجمعیۃ پریس، دہلی ۔ طبع اول ۱۹۵۹ء، (ناشر مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد، دہلی)

۲۵۔ ایضاً صفحات ۹۶، ۹۷، اور ۹۸

چھٹا باب:

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء

۱- جنگ آزادی کی تیاری

۲- سپاہیوں اور عوام کو بیدار کرنے کے لیے علامتوں کا استعمال

۳- جنگ آزادی: عسکری جدوجہد کی تفصیلات

۴- دہلی کی فتح اور بہادر شاہ کی گرفتاری

۵- علاقائی جنگوں کی مختصر روداد

بلند شہر

مظفر نگر

شاملی

آگرہ

فتح گڑھ اور فرخ آباد

علی گڑھ

بنارس

الہ آباد

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر یعنی انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کا نام دیا تھا۔ جب کہ اس جنگ میں ہزاروں عوام، علماء، دانشور، مزدور، کسان، چند جاگیردار اور ہندوستانی سپاہیوں کی کافی بڑی تعداد نے حصہ لیا تھا اور جنگ کے شعلے ہندوستان کے تین چوتھائی حصے پر بھڑک اٹھے تھے۔ ایسی ہمہ گیر عسکری جدوجہد کو غدر کا نام دینا تاریخ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ لیکن برسوں تک ہمارے سادہ لوح اور سہل پسند مورخوں کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ جنگ آزادی کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ چناں چہ خورشید مصطفٰے رضوی صاحب کی کتاب جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون کے دیباچہ میں ڈاکٹر کے۔ ایم اشرف صاحب لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں ہماری تصنیفوں کے ماخذ آج بھی انگریزوں کی مرتب کردہ یادداشتیں اور تاریخیں ہیں۔ بلکہ ہمارا نقطۂ نظر بھی برطانیہ نواز ہے اور ہمارے ممتاز مورخین یہ کہنے میں پس و پیش کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک ہماری جنگ آزادی کا پہلا اعلان تھا۔ مسٹر سین اور مجمدار جیسے چوٹی کے مورخین نے یہ بھی لکھا کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں وہابی علما نے شرکت نہیں کی۔ حالاں کہ خود سرکاری بیانات سے اس کا جگہ جگہ اظہار ہوتا ہے۔ میں مختصراً یہ عرض کرنے میں حق بہ جانب ہوں کہ مسٹر ساورکر کے بعد تاحال کسی ہندوستانی مورخ کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس جدوجہد آزادی کی مفصل اور مسلسل تاریخ ہندوستانی نقطۂ نظر سے اور ہندوستانی ماخذ کی مدد سے مرتب کرتا۔''[۱]

اس میں شک نہیں کہ وِنایک دامودر ساورکر نے ۱۹۰۹ء میں انگریز مورخوں کے دیے ہوئے نام 'غدر' کو چیلنج کیا تھا اور ہندوستان کے تین چوتھائی علاقوں میں لڑی جانے والی جنگ کو پہلی جنگ آزادی ثابت کیا تھا۔ لیکن ساورکر کا مضمون بہت مختصر اور جنگ آزادی کے صرف ایک پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔''[۲] پچھلے باب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ناجائز حکومت کے پیدا کردہ سیاسی ماحول، معاشی لوٹ کھسوٹ اور ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' والی پالیسی کا جائزہ لیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں ہندوستانی عوام ہتھیار اٹھا لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ اس باب میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کے تین مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے گا۔ نمبر۱- جنگ آزادی کی تیاری۔ نمبر۲- عسکری جدوجہد کی تفصیلات اور نمبر۳- ناکامی اور اس کے اسباب۔

جنگ آزادی کی تیاری

اس جنگ کے تعلق سے عمومی تصور یہ بھی ہے کہ بغاوت ہندوستانی سپاہیوں کی سرکشی سے شروع ہوئی اور بعد میں سارے ملک میں پھیل کر عوامی بغاوت بن گئی۔ اس تصور کے داعی بھی سہل پسندی کا شکار ہیں اور تاریخ کے کسی واقعہ کی پشت پر کارفرما اسباب کو جاننے کی زحمت نہیں کرتے۔ خود انگریز مورخوں کا کہنا ہے جیسا کہ ارنسٹ جونس نے لکھا ہے:

> ''یہ عوامی جنگ ہے اور ہندوستان کی کسی جنگ میں آج تک عوام کی اتنی بڑی تعداد نے حصہ نہیں لیا۔ لیکن ایک بات کا ہمیں یقین ہے اور وہ یہ کہ خواہ بغاوت دبائی جائے یا نہ دبائی جائے لیکن ہندوستان ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''[۳]

لہٰذا ایسی عوامی جنگ بغیر کسی تیاری کے شروع نہیں ہو سکتی۔ محض چند سپاہیوں کی بغاوت کا غیر اہم اور چھوٹا سا واقعہ غیر فوجی امن پسند عوام کو اتنے ہمہ گیر فوجی اقدامات کے لیے متحرک نہیں کر سکتا۔ اس جنگ کے لیے یقیناً عوام اور سپاہیوں کو پہلے سے تیار کیا گیا ہوگا۔ چناں چہ جنگ آزادی شروع کرنے والے بے شک ہندوستانی سپاہی تھے اور اس میں حصہ لینے والے ہزاروں عوام تھے لیکن اس کی تیاری کرنے اور منظم کرنے والوں میں جن لوگوں کے نام سرفہرست ہیں۔

۱- گولکنڈے کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کے پرپوتے دلاور جنگ مولوی احمد اللہ شاہ فیض آبادی۔

۲- مرہٹہ پیشوا باجی راؤ کے منہ بولے (متبنیٰ) بیٹے نانا دھوندو پنت (یہ عام طور پر نانا صاحب کے نام سے مشہور ہیں۔) نانا صاحب باجی راؤ کے پورے خاندان کے ساتھ کانپور کے قریب بٹھور نام کے ایک مقام میں رہتے تھے۔

۳- مولانا فضل حق خیرآبادی۔

۴- نانا صاحب کے وزیر مولوی عظیم اللہ خان۔

۵- روہیلہ سردار جنرل بخت خان۔ اور

۶- واجد علی شاہ کے وزیر علی نقی خان۔

مولوی احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ سے آگرہ تک گاؤں گاؤں، شہر شہر گھوم کر عوام کو جنگ کے لیے تیار کیا۔ ان کے جلسوں میں دس دس ہزار لوگ شریک ہوتے تھے۔ نانا صاحب نے ۱۸۵۷ء سے دو سال قبل ایک خفیہ انقلابی جماعت بنائی۔ اپریل کے آخری ہفتے میں اپنے وزیر مولوی عظیم اللہ خان کو لے کر وہ مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے دہلی پہنچے اور بہادر شاہ ظفر سے ملاقات کر کے جنگ آزادی شروع کرنے کی تاریخ مقرر کی۔ ۳۱/مئی ۱۸۵۷ء کا دن مقرر کیا گیا۔ اس دن سارے ہندوستان میں مختلف فوجی چھاؤنیوں سے ایک ساتھ جنگ شروع کرنے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ نانا صاحب نے اس کے بعد ہندوستان کے گوشے گوشے میں اپنے قاصد روانہ کیے۔ نانا صاحب مولوی عظیم اللہ خان کے ساتھ دہلی سے لکھنؤ پہنچے۔ مولوی احمد اللہ شاہ سے ملاقات کی اور واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل کو جنگ کی پلاننگ اور تاریخ سے آگاہ کیا۔ روہیلہ سردار جنرل بخت خان سب سے قابل فوجی رہنما تھے۔ یہ بریلی کے صوبہ دار تھے اور اس عہدے سے قبل جلال آباد اور تیج وغیرہ میں معزز فوجی عہدے پر رہ چکے تھے۔ جنرل بخت خان نے وسط ہند کے روہیلوں اور پٹھانوں کو جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا۔ فوجی بھرتی شروع کی اور ہتھیار جمع کیے۔ واجد علی شاہ کے معزول وزیر علی نقی خان نے کلکتہ میں بیٹھ کر مسلمان فقیروں اور ہندو سادھوؤں کے بھیس میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے شمالی ہند کی فوجی چھاؤنیوں میں خفیہ پیغامات بھیجنا شروع کیا۔ علی نقی خان کے دعوت ناموں کے جواب میں ہزاروں ہندو سپاہیوں اور ان کے افسروں نے گنگا جل ہاتھ میں لے کر اور مسلمان سپاہیوں اور ان کے افسروں نے قرآن پاک ہاتھ میں لے کر قومی جنگ آزادی میں حصہ لینے اور انگریزوں کو ملک سے نکال دینے کی قسم کھائی۔ مولانا فضل حق خیر آبادی یگانۂ روزگار عالم، عربی کے ماہر ادیب و شاعر، بڑے مفکر، مدبر اور سیاست داں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل آپ نے اکثر والیان ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ جنگ شروع ہوتے ہی آپ دہلی پہنچ گئے اور جنرل بخت خان کی تحریک پر جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے پیش کیا۔ اس فتویٰ کی بنیاد پر ہزاروں سپاہی جنرل بخت خان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

سپاہیوں اور عوام کو بیدار کرنے کے لیے علامتوں کا استعمال

انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو بیدار کرنے اور عوام کو جنگ کے لیے تیار کرنے کے لیے انقلابی لیڈروں نے گیہوں کے آٹے کی چپاتیاں اور کنول کے سرخ پھولوں کو بطور علامت استعمال کیا۔ ۱۸۵۷ء کے پہلے تین ماہ میں چپاتیاں تقریباً ہر گاؤں میں نہایت تیزی کے ساتھ تقسیم ہوئیں۔ جنوری سے مارچ تک تمام شمالی ہند میں بارک پور سے انبالہ تک اور دہلی سے ساگر اور نربدا

تک کے علاقے میں پھیل چکی تھیں۔ یہ چپاتیاں شمالی ہند کے ہر فوجی چھاؤنی میں بھی تقسیم ہوئیں۔ ان کی تقسیم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک آدمی پانچ چپاتیاں لے کر اپنے گاؤں سے نکلتا اور پانچ گاؤں میں پہنچ کر ایک ایک چپاتی ایک آدمی کو دیتا اور اسے ہدایت کرتا کہ وہ اسی طرح کی چپاتیاں پانچ گاؤں میں تقسیم کرے۔ چپاتیوں کا تقسیم کا خیال غالباً چین سے ہندوستان آیا ہوگا۔ چینی تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۳۶۸ء میں منگولوں کی حکومت ختم کرنے کے لیے وہاں کے عوام میں اسی طرح روٹیاں تقسیم کی گئیں تھیں۔ اس پیغام رسانی کے بعد چینی عوام نے متحدہ ہو کر منگولوں کی حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔

کنول کے پھول کی تقسیم بھی چپاتیوں کی طرح تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کنول کا پھول فوجی چھاؤنیوں میں تقسیم کیا گیا۔ طریقہ کار یہ تھا کہ ایک آدمی کنول کا ایک پھول لے کر فوجی چھاؤنی میں جاتا اور پھول ایک ہندوستانی سپاہی کو پکڑا دیتا۔ وہ سارے سپاہیوں میں گردش کر کے پھر پہلے آدمی کے پاس پہنچ جاتا۔ کنول کا سرخ پھول دیکھ کر سپاہی کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور وہ غضب ناک نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ کر پھول دوسرے سپاہی کو پکڑا دیتا۔ پھول دیکھ کر سپاہیوں میں جو تبدیلی رونما ہوتی اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے سپاہیوں کو پہلے سے علم تھا کہ پھول کے ذریعے انھیں جنگ میں حصہ لینے کے لیے تیار رہنے کا پیغام دیا جا رہا ہے۔ کنول کا پھول ہندوستانیوں کے لیے مذہبی اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ تخلیق کے دیوتا برہما کنول کے پھول پر بیٹھ کر اپنی مخلوق کو دیکھنے کے لیے آسمانوں سے زمین پر آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب سپاہی پھول کی طرف دیکھتا ہے تو وہ برہما کا درشن کرتا ہے۔ اور براہ راست ان کے پیغام کو سنتا ہے۔ اس طرح کے ہزاروں پھول پشاور سے بیرک پور (بنگال) تک مختلف چھاؤنیوں میں گھمائے گئے۔[۵]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر (فوجی بغاوت) کا نام دیا ہے۔ یعنی ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت۔ بغاوت کی وجوہات کے بارے میں انگریز مورخوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا دعویٰ ہے کہ کمپنی نے فوج کے لیے نئے کارتوس تیار کروائے تھے۔ وہ کارتوس ۱۸۵۷ء کے ابتدا میں فوج کو دیے گئے۔ ان کارتوسوں پر چربی سے چکنی کی ہوئی ایک جھلی چپکائی جاتی تھی۔ جسے دانتوں سے کھینچنا پڑتا تھا۔ کارتوسوں کی تیاری کا کارخانہ ڈم ڈم میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کارخانے کے ایک ملازم سے ہندوستانی سپاہیوں کو معلوم ہوا کہ کارتوسوں کی تیاری میں گائے اور سور کی ملی جلی چربی استعمال کی جا رہی ہے۔ چناں چہ جنوری ۱۸۵۷ء ہی میں تربیت گاہ کے سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کارتوسوں کو استعمال کرنے کے لیے جب سپاہیوں پر دباؤ ڈالا گیا تو بغاوت پھوٹ پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ جنگ کی ابتدا کارتوسوں کے تنازعے

سے ہوئی۔ لیکن کارتوس ہی بغاوت کی وجہ تھے اس کی تردید ان تاریخی حقائق سے ہوتی ہے جن کا ذکر ہم نے پچھلے صفحات میں کیا ہے۔

جنگ آزادی: عسکری جدوجہد کی تفصیلات

انقلابی لیڈروں نے جنگ آزادی کی تیاری کی تھی اور جنگ آزادی شروع کرنے کی تاریخ نہایت احتیاط سے خفیہ طور پر ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء مقرر کی تھی۔ مگر میرٹھ میں تاریخ مقررہ سے پہلے جنگ شروع ہو گئی۔ جس واقعہ کی بنا پر میرٹھ کے ہندوستانی سپاہیوں نے ہتھیار اٹھا لیے تقریباً ویسا ہی واقعہ فروری ۱۸۵۷ء میں برہام پور کی رجمنٹ ۱۹ کو پیش آیا۔ ۲۶ فروری کو رجمنٹ ۱۹ کے سپاہیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ انگریز افسروں نے حکم دیا کہ کارتوس استعمال نہیں کرو گے تو سخت سزا دی جائے گی۔ سپاہیوں نے کارتوس استعمال کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ ہتھیار اٹھا لینے کی دھمکی دی۔ تب برما سے ایک انگریز سپاہیوں پر مشتمل رجمنٹ بلائی گئی اور رجمنٹ ۱۹ کے سپاہیوں کو سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ بارک پور کی رجمنٹ ۳۴ کے ایک بہادر سپاہی منگل پانڈے سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ اس کے سامنے رجمنٹ ۱۹ کے سپاہیوں کو گولی مار دی جائے۔ اس نے اپنے ساتھیوں پر زور ڈالا کہ بغاوت کے لیے مئی کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ فوری بغاوت شروع کر دی جائے۔ مگر اس کے ساتھی قبل از وقت بغاوت کے لیے راضی نہ ہوئے تو وہ خود بندوق سنبھال کر میدان میں نکل آیا۔ انگریز افسر نے منگل پانڈے کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ مگر اس کے ساتھی ٹس سے مس نہ ہوئے تو افسر نے پھر سے حکم کو دہرایا تب منگل پانڈے نے افسر پر گولی چلا دی۔ کافی کشمکش اور خون خرابے کے بعد گورے سپاہیوں نے منگل پانڈے کو گرفتار کر لیا۔ اور ۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو اُسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کے بعد سارے ہندوستانی سپاہیوں کو جنھوں نے منگل پانڈے کو گرفتار کرنے کا حکم نہیں مانا تھا ہولناک سزائیں دی گئیں۔ برہام پور کی رجمنٹ ۱۹ اور بارک پور کی رجمنٹ ۳۴ کے سپاہیوں سے ہتھیار لے کر انھیں برخاست کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً ساری فوجی چھاؤنیوں میں آگ سی لگ گئی اور کارتوسوں کے استعمال سے انکار کے بے شمار واقعات ہونے لگے۔ لیکن ہندوستان گیر جس جنگ کا پلان بنایا گیا تھا وہ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔

وہ جنگ میرٹھ سے بروز اتوار ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہوئی۔ ۶ مئی کو میرٹھ کی فوجی چھاؤنی کے سپاہیوں نے چربی والے کارتوس کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ اس جرم میں ۸۵ سپاہیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا اور ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو انھیں دس دس سال کی قید کی سزا سنائی گئی۔ یہ ۸۵ سپاہی

فوجی افسر تھے جو اپنی فوج کے ناک سمجھے جاتے تھے۔ ان کی وردیاں پیچھے سے پھاڑ دی گئیں۔ سنگینوں کے پہرے میں اور تمام سپاہیوں کے سامنے نہایت ذلت آمیز طریقے سے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ پھر ان سے ان کے فوجی نشانات چھین لے گئے۔ اس طرح ذلیل کر کے اُن کو جیل بھیجا گیا۔ سارے ہندوستانی سپاہی چپ چاپ یہ تماشا دیکھتے اور پیچ و تاب کھاتے رہے۔ کیوں ہندوستانی سپاہی انگریز سپاہیوں کی سنگینوں کے گھیرے میں تھے اور سامنے توپ خانہ تھا۔

دوسرے دن یعنی ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو ہندوستانی سپاہیوں نے ہتھیار اٹھا لیے۔ میرٹھ فوجی چھاؤنی کے انگریز افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار کر ہندوستانی سپاہی جن کی تعداد ۲ ہزار تھی آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے دہلی پہنچ گئے۔ یوں وہ جنگ جو ۳۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو سارے ہندوستان میں ایک ساتھ شروع ہونی تھی میرٹھ کے حادثے کی وجہ سے قبل از وقت شروع ہو گئی۔ اکثر انگریز مورخین کا خیال ہے کہ میرٹھ میں وقت سے پہلے بغاوت کا شروع ہو جانا انگریزوں کے لیے برکت اور ہندوستانی انقلابیوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ چناں چہ مالےسن کا کہنا ہے کہ:

> "اگر ٹھیک طے شدہ وقت کے مطابق ایک ساتھ ایک تاریخ کو ہی سارے ہندوستان میں جنگ کی شروعات ہوتی تو ہندوستان میں ایک بھی انگریز نہ بچتا اور انگریزی حکومت کا اسی وقت خاتمہ ہو گیا ہوتا۔"[۲]

دہلی اور اس کے قرب و جوار میں اس وقت آخری مغل بادشاہ ظفر کی حکمرانی تھی۔ اگر چہ کہ عملاً ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا حکم چلتا تھا۔ لیکن عوام کے دلوں پر ابھی تک مغل ہی حکمرانی کر رہے تھے۔ چناں چہ میرٹھ کے سپاہی دہلی میں داخل ہونے کے بعد سیدھا بہادر شاہ کے حضور پہنچ گئے اور ان سے رہنمائی کی درخواست کی۔ بیاسی سالہ صوفی منش، شاعر اور درویش صفت بہادر شاہ جو لال قلعے کے حدود کے اندر ہی اپنی عملداری پر قانع تھے سپاہیوں کی درخواست کے جواب میں فرمایا کہ میرے پاس خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دوں، فوج نہیں کہ تمھاری مدد کر سکوں اور ملک نہیں کہ تحصیل کے لیے نوکر رکھوں۔ جب بادشاہ نے فوج اور خزانہ نہ ہونے کی بات کی تو انقلابی سپاہیوں نے کہا کہ ہم تمام انگریزی خزانے لوٹ کر آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے۔ بیاسی سالہ بیمار مجبور اور بوڑھے بادشاہ کی رگوں میں بھی جو مغلوں اور غیور راجپوتوں کا خون دوڑ رہا تھا۔ سو اس خون نے جوش مارا اور بہادر شاہ نے اپنی عمر اور مجبوری کا خیال کیے بغیر باغیوں کی دوسرے الفاظ میں پہلی جنگ آزادی کی رہنمائی قبول کر لی۔

۱۱ رمئی کو بادشاہ کی سلامی میں ۲۱ توپیں داغی گئیں۔ مغل شہزادوں، مرزا مغل، مرزا خضر سلطان، مرزا

ابوبکر، مرزا سید، اور مرزا عبداللہ وغیرہ کو مختلف انقلابی فوجی دستوں کا سردار مقرر کیا گیا۔ مرزا مغل کمانڈر ان چیف بنائے گئے۔ اس نئے انتظام کے ساتھ ہی جنگ آزادی کی ناکامی کی بنیاد بھی پڑ گئی۔ کیوں کہ ان شہزادوں نے میدان جنگ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

انگریزوں کو دہلی سے بے دخل کرنے کے لیے متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ ۱۱رمئی سے ۳رجون تک دہلی انگریزوں سے خالی ہوگئی۔ اس دوران اطراف و اکناف سے بے شمار آزاد فوجی دستے جمنا کا پل پار کر کے دہلی میں داخل ہوتے رہے۔ ان دنوں جنرل صمد خان فوج کی رہنمائی کرتے رہے۔ ۲رجولائی کو بریلی کے صوبہ دار جنرل بخت خان اپنے چودہ ہزار لشکر اور خزانے کے ساتھ دہلی میں داخل ہوئے ان کے ساتھ نانا صاحب کے بھائی بالا صاحب اور مولانا فضل حق خیرآبادی بھی دہلی آئے۔ ان کے ہمراہ کفن بردوش مجاہدین کی فوج بھی تھی جن کی رہنمائی مولانا سرفراز علی کر رہے تھے۔ بہادر شاہ نے جنرل بخت خان کو دہلی کا منتظم اور فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے انھیں لارڈ گورنر کا خطاب دیا۔ جنرل بخت خان کے دہلی میں داخل ہوتے ہی انگریزوں کو یقین ہوگیا کہ ہندوستان ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

دہلی کی فتح اور بہادر شاہ کی گرفتاری

انگریزوں کا ایقان تھا کہ ہندوستان میں انگریزی راج کو باقی رکھنا ہو تو ضروری تھا کہ پہلے دہلی فتح کی جائے لہٰذا لارڈ کیننگ نے ساری فوجی طاقت دہلی فتح کرنے کے لیے لگا دی۔ رنگون، بمبئی اور پنجاب سے تازہ دم فوجیں دہلی کی طرف روانہ کر دی گئیں۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں کی (Opium Trade) یعنی افیون کی اجارہ داری کے خلاف چین میں شورش برپا ہوئی تھی۔ اس کو چین کی تا پنگ بغاوت کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں دوسری جنگ افیون (2nd Opium War) چھڑ گئی تھی برطانیہ کی فوجیں اس بغاوت کو کچلنے کے لیے چین جا رہی تھیں۔ لارڈ کیننگ نے ان فوجوں کو رنگون کے راستے ہندوستان طلب کر لیا۔ یہ فوجی دستوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ اختیار میں ماڈرن ذرائع حمل و نقل اور ٹیلی گراف، جیسے مواصلاتی ذرائع موجود تھے۔ ۱۸۴۷ء میں ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی قائم ہوئی۔ اور چند برسوں میں تیزی سے ریلوے لائنیں بچھا دی گئیں۔ ریلوے لائنیں بچھانے کا مقصد تجارتی ضروریات کے علاوہ فوج کو تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا بھی تھا۔ چناں چہ ریلوے لائنوں کے لیے مقامات کا انتخاب کرنے اور ان کا طول و عرض متعین کرنے میں فوجی ماہرین سے مشورہ لیا گیا تھا۔[۵] ۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران فوجی سربراہوں نے ریلوے اور ٹیلی گراف کی

سہولتوں سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا۔ انگریزوں نے مختلف چھاؤنیوں سے اور مددگار دیسی والیانِ ریاست کی فوجوں کو جمع کر کے دہلی پر ہلہ بول دیا۔ اور ادھر انقلابی لیڈروں کی واضح کوتاہی اور جنگی حکمتِ عملی سے عدم واقفیت کا ثبوت ملتا ہے۔ جنگ کے اس نازک موڑ پر انقلابی لیڈروں کو چاہیے تھا کہ وہ اپنی ساری طاقت اکٹھی کر کے دہلی کو بچانے اور دہلی کے مضافات میں انگریزی فوجوں کو تہس نہس کرنے کے لیے استعمال کرتے۔ اس کے بجائے سارے انقلابی لیڈر اپنے اپنے علاقوں میں انگریزوں سے لڑنے میں مصروف رہے۔ اور دہلی کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔ اور جنرل بخت خان تنہا نہایت سنگین حالات اور بے سروسامانی کے باوجود دہلی کا دفاع کرتے رہے۔ چناں چہ جنرل بخت خان نے ۲ رجولائی سے ۱۵ رستمبر تک دہلی کو بچائے رکھا۔ دہلی فتح کرنے کے لیے انگریزوں نے سخت نقصان برداشت کیا۔ ان کے سینکڑوں سپاہی اور کئی مشہور افسر مارے گئے۔ ادھر ہزاروں ہندو اور مسلمان سپاہیوں اور عوام نے اپنی جانوں کی قربانی دی۔ ۱۵ رستمبر کو انگریزی فوجیں تین طرف سے دہلی میں داخل ہوئیں۔ ۱۵ رستمبر سے ۲۳ رستمبر تک دہلی کا ہر کوچہ و بازار میدانِ جنگ بن گیا۔ ۲۰ رستمبر کو بہادر شاہ ظفر، مرزا مغل، مرزا ابوبکر، مرزا خضر سلطان اور مرزا عبداللہ کو انگریزوں نے ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کر لیا۔ اسی روز سارے شہزادوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کے سروں کو خوان میں رکھ کر بہادر شاہ کے سامنے لایا گیا تو اس پر بوڑھے بادشاہ نے کہا --

"الحمد للہ! تیمور کی اولاد اسی طرح سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی ہے۔"

وہ مغلیہ خاندان جس نے اپنی انتظامی صلاحیت، تدبر اور سیاسی دور اندیشی سے ہندوستان کو ایک مضبوط مرکزی حکومت دے کر جنت نشان بنا دیا تھا۔ اُسی خاندان کے آخری بادشاہ نے ملک کو بیرونی تسلط سے آزاد کرانے کی تمنا میں آزادی کا سورج طلوع ہوتے تو نہ دیکھ سکا۔ لیکن اپنی ساری جواں سال اولاد کو قربان کر کے اس مٹی کو ان کا خون دے کر پاک اور مقدس کر دیا۔

بہادر شاہ ظفر پر جنوری ۱۸۵۸ء میں بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا۔ اور ۷ ار اکتوبر ۱۸۵۸ء کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ رنگون کے ایک سنسان اور چھوٹے سے بنگلے میں ۷ رنومبر ۱۸۶۲ء کو ۸۹ سال کی عمر میں بہادر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ بہادر شاہ کی موت کو نہایت پوشیدہ رکھا گیا اور نہایت رازداری میں تدفین کی گئی۔ بہادر شاہ کی موت کے بعد بھی اس بنگلے پر سے پہرہ نہیں ہٹایا گیا۔ وہ انیسویں صدی کے آخیر تک رہا۔ کسی ہندوستانی کو اس علاقے میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ دہلی کی فتح سے جنگ آزادی ختم نہیں ہوئی۔ جنگ کے شعلے ہندوستان کے تین چوتھائی رقبے پر ۱۹ رجون ۱۸۵۸ء تک بھڑکتے رہے۔ اس وسیع و عریض علاقے میں سینکڑوں ایسے شہر اور مقامات ہیں جہاں بے سروسامان مجاہدین کی قوت مدافعت نے انگریزوں کو حیران کر دیا تھا۔ ان

تمام مقامات کی جنگی تفصیلات کا ذکر ممکن نہیں ہے۔ لیکن چند ایک ایسے شہر اور مقامات ہیں جن کا ذکر کیے بغیر جنگ آزادی کا بیان تشنہ رہ جائے گا۔

علاقائی جنگوں کی مختصر روداد

بلند شہر:

۲۹ مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے ولی داد خان کو وہاں کا صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ ولی داد خان نے مہرباں علی اور مظفر علی امروہوی کی مدد سے ہزاروں کو جز فوج میں بھرتی کیے اور انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ مظفر علی امروہہ کے مشہور منصب دار درویش علی خان کی اولاد میں سے تھے۔ مشہور علی برادران، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی مظفر علی کے نواسے ہیں۔

مظفر نگر:

ضلع مظفر نگر میں بہت سے علما نے جن کی رہنمائی حضرت حاجی امداد اللہ کیرانوی کر رہے تھے انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی۔ اسی ضلع کے ایک قصبہ کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے انقلابی فوج تیار کی۔ اس علاقے کے مجاہدین کی قربانی تاریخ کے صفحات پر یادگار رہے گی۔ بڑے بڑے علما نے حاجی امداد اللہ کیرانوی کی قیادت میں یہاں کے علاقے تھانہ بھون اور شاملی میں جہاد کیا۔

شاملی کی جنگ:

انگریزوں کا دستہ ہتھیار لے کر سہارن پور سے شاملی کی طرف جا رہا تھا۔ جب حاجی امداد اللہ کو اس کا پتہ چلا تو ان کے مجاہدین نے اس دستہ پر حملہ کر کے اس کے ہتھیار چھین لیے۔ اس کی اطلاع جب کلکٹر سہارن پور کو ملی تو وہ فوج لے کر شاملی پہنچ گیا۔ حاجی امداد اللہ نے شاملی پر حملہ کر دیا۔

حاجی امداد اللہ کے مجاہدین میں ہندوستان کے وہ عالم تھے جن کے علم اور تقویٰ کی شہرت سارے عالم اسلام میں تھی۔ حضرت حافظ ضامن علی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی۔ شاملی پر حملہ کرنے والے مجاہدین کے دستے میں شامل تھے۔ اس جنگ میں حافظ ضامن علی شہید ہوئے۔

آگرہ:

آگرہ انگریزی فوج کا بڑا اسٹیشن تھا۔ مولانا احمد اللہ شاہ نے آگرہ میں بیداری پیدا کی تھی۔ مولانا نے یہاں کے علما کو بھی متحرک کر دیا تھا اور ان کی باقاعدہ جماعت ''مجلس علماء'' کے نام سے بنائی تھی۔ یہاں مولانا فیض احمد بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خان انقلابی تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ جب دہلی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا تو آگرہ کی انگریزی فوج نے قلعے میں پناہ لی۔ ۵/ جولائی کو نیچ اور نصیر آباد کے انقلابی آگرہ پہنچے اور کالی ندی پر انگریز فوجوں سے ایک خوں ریز جنگ کے بعد فتح پا کر شہر میں داخل ہوئے اور قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ آگرہ میں آخری جنگ ۶/ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ہوئی اس جنگ کی رہنمائی شہزادہ فیروز شاہ کر رہا تھا۔ دہلی کی فتح کے بعد انگریزی فوجوں نے آگرہ پہنچ کر انقلابیوں کو آگرہ سے ٹال دیا۔

فتح گڑھ اور فرخ آباد:

۱۸/ جون کو فرخ آباد کے سپاہیوں نے ہتھیار اٹھا لیے اور نواب تفضل حسین خان کو اپنا حاکم بنا لیا۔ فتح گڑھ میں رجمنٹ ۱۰ نے ۳/ جون کو بغاوت شروع کی۔ ۱۸/ جون کو ایک اور رجمنٹ باغی ہوگئی۔ جیل توڑ کر قیدیوں کو رہا کر لیا گیا۔ نواب تفضل حسین خان کو ۲۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ انگریزوں کے مکانات کو اور سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی۔

علی گڑھ:

علی گڑھ میں نمبر ۹ پیادہ رجمنٹ مقیم تھی۔ میرٹھ سے جنگ کی شروعات ہونے کے بعد ایک برہمن علی گڑھ آیا۔ اور ہندوستانی فوجوں کو انگریزوں سے لڑنے کی دعوت دی۔ اس دوران انگریزوں کو پتا چل گیا۔ برہمن کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ جیسے ہی برہمن کا جسم پھندے سے لٹک گیا ایک مسلمان سپاہی ننگی تلوار لے کر آگے بڑھا اور برہمن کے مردہ جسم کی طرف اشارہ کر کے چلایا۔ ''دوستو! یہ شہید خون میں نہا گیا۔ یہ ہمارے دین پر قربان ہوگیا۔'' یہ نعرہ سن کر سارے سپاہیوں نے تلواریں نیام سے نکال لیں انگریز افسر گھبرا کر چپ چاپ علی گڑھ سے بھاگ گئے۔ اس کے بعد مولانا عبدالجلیل پانچ ہزار سپاہی لے کر علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ دو مہینے کے بعد انگریزوں نے علی گڑھ پر حملہ کیا۔ مولانا عبدالجلیل لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں شہید ہوگئے۔

بنارس:

بنارس انگریزوں کی بہت بڑی فوجی چھاؤنی تھا۔ یہاں کے مندروں میں انگریزی حکومت کی بربادی کے لیے پرارتھنا شروع ہوگئی تھی اور فوجی کیمپ میں مولویوں کی خفیہ انقلابی جماعتیں مصروف تھیں۔ ان سرگرمیوں سے انگریز بہت خوف زدہ تھے۔ چناں چہ لارڈ کیننگ نے تازہ دم فوج کے ساتھ جنرل نیل کو بنارس روانہ کیا۔ جنرل نیل نے ہندوستانی سپاہیوں سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا۔ جس کی وجہ سے بنارس میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ ہندو اور مسلمان سپاہیوں کے ساتھ سکھ سپاہی بھی مل گئے اور جنرل نیل کی فوج کو زبردست نقصان پہنچایا۔ لیکن مکمل فتح نہ حاصل کر سکے۔ یہ لڑائی ۴ر جون کو ہوئی۔ بغاوت فرو کرنے کے بعد جنرل نیل کی فوجوں نے بنارس اور اس کے مضافات میں وہ مظالم ڈھائے اس کی مثال ہلاکو اور چنگیز خان کے مظالم سے دی جا سکتی ہے۔ ہزاروں بے قصور انسانوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ بنارس کے اطراف کے بیسیوں گاؤں کو زمین کے برابر کر دیا گیا۔

الٰہ آباد:

۸ر جون کی رات کو سپاہیوں اور عوام نے مل کر انگریزی فوج پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں نے قلعہ میں پناہ لی جہاں سکھ سپاہی ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ انقلابیوں نے جن کی رہنمائی رام چندر کر رہے تھے مولوی لیاقت علی کو اپنا لیڈر چن لیا۔ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر مولوی لیاقت علی کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ مولوی صاحب نے سپاہیوں کو منظم کرنے کے فوری بعد قلعے پر حملے کر دیا۔ انگریزوں نے قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا اور شکست کھا کر واپس قلعے میں چلے گئے۔ اس دوران جنرل نیل بنارس کو تباہ کر کے الٰہ آباد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ سن کر سارا شہر خالی ہو گیا۔ ۱۷ر جون کو جنرل نیل کی فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں۔ مولوی صاحب نے سخت مقابلہ کیا۔ لیکن شہر خالی کرنے پر مجبور ہو گئے اور اپنے مجاہدین کو لے کر گنگا پار کیا اور نانا صاحب کے پاس کان پور چلے گئے۔ انقلابیوں کے چلے جانے کے بعد جنرل نیل نے الٰہ آباد کو دوسرا بنارس بنا دیا۔

مولوی لیاقت علی ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد چار سال تک انگریزی فوج میں ملازم رہے۔ پھر ملازمت چھوڑ کر مذہبی اور اصلاحی کام شروع کیا۔ مولوی لیاقت علی سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر تھے۔ ۱۸۵۷ء سے کچھ سال پہلے انقلابی تحریک میں شامل ہو گئے۔ نانا صاحب کی خفیہ میٹنگ میں عظیم اللہ خان، مولانا احمد اللہ شاہ اور جنرل بخت خان

کے ساتھ مولوی لیاقت بھی شریک رہے۔ جنگ آزادی شروع کرنے کی تاریخ ۳۱ مئی مقرر کی گئی تھی اور مولوی صاحب پر اس طے شدہ پروگرام کی اطلاع انقلابی رہنماؤں تک پہنچانے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔

الہ آباد پر قبضے کے بعد انگریزوں نے اسے اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ لارڈ کیننگ بھی کلکتہ سے وسط ہند کی بغاوت کو دبانے کے لیے یہیں آ گیا۔ انگریزوں نے الہ آباد میں بے شمار انسانوں کو پھانسی دی۔ بے شمار دیہات نذر آتش کر دیے گئے۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً چھ ہزار انسانوں کو قتل کیا گیا اور سینکڑوں عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے زندہ جلائے گئے۔

فتح پور:

۱۲ جولائی کو انگریزی فوجیں جنرل نیل کی سرکردگی میں فتح پور پہنچیں۔ یہاں انقلابیوں کی رہنمائی ایک سرکاری عہدہ دار ڈپٹی مجسٹریٹ حکمت اللہ کر رہے تھے۔ نانا صاحب نے مولوی لیاقت علی کی سرکردگی میں مجاہدین کو فتح پور روانہ کیا۔ انگریزی فوجیں انقلابیوں کو شکست دے کر شہر میں داخل ہو گئیں اور تمام شہر کو آگ لگا دی گئی۔ فتح پور کا دھواں اپنے ساتھ معصوم بچوں بوڑھوں اور عورتوں کی دل دوز چیخیں اور آہیں لے کر کان پور پہنچا۔ کان پور جوش اور غصے سے کانپ اٹھا۔ اب انگریزی فوجیں کان پور کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

کان پور:

پیشوا باجی راؤ کا خاندان کان پور کے قریب بٹھور میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ انگریزوں نے پیشوا باجی راؤ کی ریاست ۱۸۱۱ء میں ضبط کر کے انھیں ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار بنا دیا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں باجی راؤ کا انتقال ہو گیا۔ نانا صاحب ان کے جانشین تھے۔ انگریزوں نے باجی راؤ کی پنشن نانا صاحب کو دینے سے انکار کر دیا تھا کیوں کہ نانا صاحب باجی راؤ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ نانا صاحب نے ۱۸۵۳ء میں عظیم اللہ کو اپنا وکیل بنا کر لندن بھیجا۔ ہندو مسلم تعلقات اور اتحاد کے بارے میں آج ہمارے ذہنوں میں شبہات پیدا ہوتے ہیں کہ شاید مسلم دور حکومت میں ہندو اور مسلمان آپس میں مذہبی بنیاد پر جھگڑتے رہتے تھے۔ انگریزوں نے ہمیں یہی باور کروایا تھا۔ یہ اور ایسی بہت ساری مثالیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ ہندو راجاؤں کے ریاستی، فوجی اور ذاتی معاملات مسلمان افسر انجام دیا کرتے تھے اور مسلمان حکمرانوں کے مشیر ہندو افسر ہوا کرتے تھے۔ نانا

صاحب اور عظیم اللہ خان کا رشتہ ایک مثال ہے۔ دوسری مثال بہادر شاہ ظفر کی ہے۔ جب بہادر شاہ ظفر کی پنشن روک لی گئی تو بہادر شاہ نے راجہ رام موہن رائے کو اپنا وکیل بنا کر لندن روانہ کیا تھا۔ دور کیوں جائیے جب ساؤتھ افریقہ کے Businessman عبداللہ کو وکیل کی ضرورت پڑی تو اس نے ہندوستان سے مہاتما گاندھی کو ساؤتھ افریقہ بلوایا تھا۔ تحریک آزادی ہند میں اس واقعہ کی بڑی اہمیت ہے۔ افریقہ کے تجربے نے گاندھی جی کو یقین دلایا تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مفادات ایک ہیں اور وہ انگریزوں کے ساتھ مساویانہ شہری بن کر نہیں رہ سکتے۔ عظیم اللہ خان انگلینڈ میں نانا صاحب کا مقدمہ نہیں جیت سکے اور نہ نانا صاحب کو وظیفہ دلا سکے۔ عظیم اللہ خان لندن میں قیام کے دوران ستارہ کے راجہ رانگو باپوجی سے مل کر انگریزوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کی اسکیم کے تعلق سے گفتگو کی تھی۔ رانگو باپو تو ستارہ واپس ہو گئے مگر عظیم اللہ اپنے مشن کے لیے دوسرے ممالک کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے یورپ کا دورہ کیا۔ ترکی کے خلیفہ سے ملے اور روس جا کر وہاں کے سربراہوں سے ملاقات کی۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ آزادی سے پہلے ہندوستان میں مشہور ہو گیا تھا کہ نانا صاحب نے روس سے معاہدہ کر لیا ہے۔ اور روس ہندوستان پر حملہ کرے گا۔

عظیم اللہ خان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتداء میں انھوں نے ایک انگریز کے گھر میں معمولی حیثیت کی ملازمت کی تھی۔ پھر کان پور کے ایک اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں جانتے تھے۔ نانا صاحب نے ان کی قابلیت کا شہرہ سن کر انھیں اپنا مشیر خاص بنا لیا۔ خورشید مصطفےٰ رضوی صاحب نے ساورکر کے حوالے سے عظیم اللہ خان کے بارے میں لکھتے ہیں: 9

> "۱۸۵۷ء کے اہم کرداروں میں عظیم اللہ خان کا نام سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے۔ بغاوت کو منظم اور مکمل کرنے والی بہت سی اسکیموں میں عظیم اللہ خان کی اسکیمیں خصوصیت سے قابل غور ہیں۔"

۴ رجون ۱۸۵۷ء کی رات کو کان پور کی ہندوستانی رجمنٹ نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ اور صوبہ دار شمس الدین خان اور ٹیکا سنگھ کی رہنمائی میں نواب گنج کی طرف مارچ کیا جہاں نانا صاحب کی فوجی چھاؤنی تھی۔ کان پور کے عوام نے مولانا سلامت اللہ کی قیادت میں آزادی اور انقلاب کا پرچم لہرایا۔ عورتیں بھی میدان میں نکل آئیں جن میں عزیزن نامی ایک گائیکہ بھی شامل تھی۔ وہ مردانہ لباس میں گھوڑے پر سوار انقلابیوں کی پہلی صف میں مارچ کرتی

تھی۔ سپاہیوں اور عوام نے مل کر نانا صاحب کو فوجی سلامی دی اور آزاد حکومت کا اعلان کر دیا۔ ملکی اور فوجی انتظامات عظیم اللہ خان نے سنبھال لیے۔ مولانا سلامت علی کو عوامی مجاہدین کا سالار مقرر کیا گیا اور دوسرے عہدوں پر شاہ علی، رحیم خان جوالا پرشاد، ہولاس سنگھ اور ٹیکا سنگھ مقرر کیے گئے۔ ۲۳ر جون کو جو جنگ پلاسی کا سو سالہ دن تھا انقلابیوں نے انگریز فوجی چھاؤنی پر حملہ کر دیا۔ انگریزوں نے صلح کی درخواست کی اور کان پور سے نکل جانا منظور کر لیا۔ ۲۸ر جون کو نانا صاحب نے دربار کیا۔ سب سے پہلے بہادر شاہ ظفر شہنشاہ ہند کی سلامی کے لیے ۱۰۱ توپیں داغی گئیں اور پہلی جولائی کو نانا صاحب شہنشاہ ہند کی طرف سے کان پور کے حاکم مقرر ہوئے اور رسم تاج پوشی منائی۔

بنارس، الہ آباد اور فتح پور کو برباد کرنے کے بعد انگریزی فوجیں جنرل ہیولاک کی سرکردگی میں کان پور کی طرف بڑھیں اور ایک خون ریز جنگ کے بعد کان پور پر قبضہ کر لیا۔ نانا صاحب پسپا ہو کر بٹھور چلے گئے۔ انگریزوں نے کان پور کے مجاہدین اور نہتے عوام پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے اور بنارس، الہ آباد اور فتح پور کی یاد تازہ کر دی۔

روہیل کھنڈ:

۳۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو بریلی میں جنرل بخت خان نے دن کے دس اور گیارہ بجے کے درمیان توپ چلا کر جنگ آزادی کے شروع ہونے کا اعلان کیا۔ انگریز فوجی چھاؤنی کو آگ لگا دی گئی۔ ہتھیار اور میگزین پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا۔ انگریز سپاہی بریلی چھوڑ کر نینی تال بھاگ گئے۔ اسی دن نواب خان بہادر خان کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا اور کوتوالی کے سامنے جشن تاج پوشی منایا گیا۔ آٹھ ممبران کی ایک کمیٹی انتظامات کے لیے تشکیل دی گئی جس میں دو ہندو اور چھ مسلمان شامل تھے۔ مسلمان ممبروں میں نواب ذوالفقار علی خان اور مدار علی خان جیسے باصلاحیت افراد بھی شامل تھے۔ حکومت کی تشکیل کے بعد سوبھا رام کو وزیر اور بخت خان کو سپہ سالار بنایا گیا۔ جس شخص نے تخت نشینی کے لیے خان بہادر خان کا نام پیش کیا تھا وہ ایک راجپوت سردار ٹھاکر جے لال سنگھ تھا۔ روہیل کھنڈ کے تمام چھوٹے بڑے قصبوں اور شہروں میں بھی عوام انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ممکن تھا کہ انگریز روہیل کھنڈ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل جاتے۔ ایسے نازک وقت میں نواب رام پور نے انگریزوں کو پناہ دے کر مجاہدین کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔

مرادآباد:

مرادآباد میں جنگ کی تیاریاں بہت پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ وہاں مولوی وہاج الدین عرف مولوی

متو،مولانا کافی،مولانا سید عالم علی اور چند دیگر علما انقلاب کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ۱۹رمئی کو مراد آباد کے عوام میدان میں آ گئے۔ لیکن نواب رام پور نے اپنی فوج کے ذریعے یہاں کے انقلاب کو دبا دیا۔ ۴رجون کو جنرل بخت خان فوج لے کر انقلابیوں کی مدد کے لیے مراد آباد آئے۔ اور یہاں کا انتظام مجو خان کے سپرد کر کے جنرل بخت خان اپنی فوج لے کر ۱۸رجون کو دہلی چلے گئے۔ بعد ازاں شہزادہ فیروز شاہ ۲۲راپریل ۱۹۵۸ء کو مراد آباد آئے اور نواب رام پور کی فوج کو شکست دے کر مراد آباد انقلابیوں کے حوالے کر دیا۔

لکھنؤ اور ریاست اودھ:

اودھ کی جنگ آزادی کا مرکزی مقام لکھنؤ تھا۔ لیکن اودھ کی ریاست کے طول وعرض میں زمینداروں، نوابوں، جاگیرداروں اور ہندو مسلم عوام نے ۳۰رمئی ۱۸۵۷ء سے ۱۶رنومبر ۱۹۵۷ء تک بے شمار جنگیں لڑی ہیں۔ ریاست میں آزادی اور انقلاب کی تیاریاں بہت پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ لکھنؤ کی انقلابی جماعت نے کابل کے امیر دوست محمد خان کو مدد کے لیے کئی خطوط لکھے تھے۔

۱۸۵۶ء میں فقیر قادر علی شاہ نے لکھنؤ میں فوجی بھرتی کا کام شروع کر دیا تھا۔ محمود حسین خان کمیدان نے بھرتی شدہ مجاہدین کی فوجی تربیت کے لیے لکھنؤ شہر کے اندر اور مضافات میں کئی مرکز قائم کیے اور ہتھیار جمع کرنے کا کام شروع کیا۔

نومبر ۱۸۵۱ء میں مولانا احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ کا دورہ فقیر کے بھیس میں کیا۔ اور انقلابی کارکنوں کی تنظیم کی۔ اس کے علاوہ مولانا نے ریاست کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ اپنی تقاریر سے عوام کے دلوں میں بزور شمشیر آزادی حاصل کرنے کی تڑپ پیدا کی۔ ان کے جلسوں میں ۱۰-۱۰ ہزار کے قریب لوگ جمع ہوتے تھے۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے انگریزوں نے مولانا کو دو مرتبہ گرفتار کیا۔ ایک بار لکھنؤ سے اور دوسری مرتبہ فیض آباد سے لیکن عوامی شورش کے خوف سے دونوں بار انھیں رہا کر دیا گیا۔ خورشید مصطفےٰ رضوی صاحب نے ساورکر کے حوالے سے اور ایک انگریز مورخ ہومز کے حوالے سے دو اقتباسات دیے ہیں: لکھا

"یہ غیر معمولی شخص چار مہینے سے بجلی کی سی تیزی سے ادھر ادھر پھر رہا تھا اور اپنی موجودگی سے جوش واحساس کی روح پھونک رہا تھا۔ میدانِ جنگ میں بھی اور کونسل ہال میں بھی ...... ہر شخص کو اس سب سے بڑے ہیرو کے

احترام میں اپنا سر جھکا لینا چاہیے جو اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ہمراہ پھر لکھنؤ میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔" (ساورکر)

اگر چہ باغی عوام بزدل تھے مگر ان کا لیڈر جذبات اور قابلیت دونوں اعتبار سے ایک بڑی تحریک کو چلانے اور ایک بڑی فوج کی کمان سنبھالنے کی پوری اہلیت رکھتا تھا اور یہ شخص فیض آباد کا مولوی احمد اللہ تھا۔" (ہومز)

اپریل ۱۸۵۷ء میں نانا صاحب اور عظیم اللہ خان لکھنؤ آئے اور جنگ آزادی شروع کرنے کی تاریخ سے وہاں کے رہنماؤں کو مطلع کیا۔ الہ آباد کے مولوی لیاقت علی بھی ان کے ساتھ تھے۔

۳۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو رات کے ۹ بجے منڈیاؤں کی فوجی چھاؤنی کے سپاہیوں نے توپ چلا کر جنگ آزادی کی شروعات کا اعلان کیا۔ دوسرے دن تحریک مجاہدین (سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کی تحریک) سے وابستہ رہنماؤں نے جلوس نکالا۔ اس جلوس میں تقریباً پندرہ سو آدمی شریک تھے۔ لیکن منڈیاؤں کی باغی فوجیں شہر تک نہ پہنچ سکیں۔ ایک مختصری لڑائی کے بعد انگریزوں نے باغیوں پر قابو پالیا۔ انہیں گرفتار کر کے بر سر عام پھانسی دے دی گئی۔ کمشنر ہنری لارنس نے خطرہ کی بو سونگھ لی اور احتیاطاً رزیڈنسی میں پناہ لے لی۔ ۳ رجون کو خیر آباد ڈویژن کے ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔

۳۰ رجون کو انقلابی فوجوں نے لکھنؤ سے بارہ میل دور چنہٹ کے مقام پر انگریزی فوج کو شکست دی۔ ۵ رجولائی کو واجد علی شاہ کے گیارہ سالہ بیٹے برجیس قدر کو لکھنؤ کا حاکم بنایا گیا۔ اور ان کی والدہ بیگم حضرت محل نے حکومت کے انتظامات سنبھال لیے۔ انقلابی فوجوں نے انگریزی رزیڈنسی کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ میں مولانا احمد اللہ شاہ انقلابیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ ہندوستانی سپاہیوں کی کمان سید برکات احمد کر رہے تھے۔ راجہ محمود آباد نے اپنے کمانڈر خان علی خان کو لکھنؤ کے مجاہدین کی امداد کے لیے روانہ کیا۔ ختم جون تک ریاست اودھ انگریزی تسلط سے آزاد ہو گیا۔

۲۰ رستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزی فوجیں جنرل ہیولاک کی سرکردگی میں کان پور سے لکھنؤ کی طرف بڑھیں اور مجاہدین کا محاصرہ توڑ کر رزیڈنسی میں داخل ہو گئیں۔ انگریزوں کی مزید تازہ دم فوج ۹ رنومبر ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ پہنچی۔ ۱۶ رنومبر کو اس فوج نے شہر پار کر کے سکندر باغ پر حملہ کر دیا۔ جہاں تین ہزار مجاہدین جمع تھے۔ سکندر باغ کا معرکہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔ یہاں مردوں کے دوش بدوش عورتوں نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔ اس معرکہ میں دو ہزار انقلابی مادر وطن کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ لکھنؤ میں آخری جنگ ۱۰ رمارچ ۱۸۵۸ء کو لڑی گئی۔ یہ جنگ دس روز تک چلتی رہی۔ جنگ کے دوران بیگم حضرت محل ہاتھی پر سوار ہو کر مجاہدین کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتی

رہیں۔ اس وقت لکھنؤ میں جنگ آزادی کے سارے رہنما جمع تھے۔ انقلابی لیڈر نانا صاحب، عظیم اللہ خان، جنرل بخت خان، مولانا احمد اللہ شاہ، مولانا سرفراز علی، مولانا فیض احمد، ڈاکٹر وزیر خان، نواب تفضل حسین فرخ آبادی، کمانڈر خان علی خان، شہزادہ فیروز شاہ، مولوی لیاقت علی، برجیس قدر اور بیگم حضرت محل۔ اس جنگ میں ہڈسن جس نے دہلی میں مغل شہزادوں کو قتل کر کے ان کا خون پیا تھا گولی کا نشانہ بن کر واصل جہنم ہوا۔ اس آخری جنگ کے بعد لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

لکھنؤ کی فتح کے بعد سارے اودھ میں مجاہدین ایک سال تک گوریلا جنگ کرتے رہے۔ اس گوریلا جنگ کے رہنما مرہٹہ سردار تانتیا ٹوپی، مولانا احمد اللہ شاہ، شہزادہ فیروز شاہ اور بیگم حضرت محل تھے۔ اگر ایسے معرکے ہندوستان کی ساری دیسی ریاستوں میں خاص طور پر رام پور، پنجاب، کشمیر، حیدرآباد اور وسط ہند کی راجپوت ریاستوں میں ہوتے تو انگریزوں کے عسکری وسائل اور فوجوں کا صفایا ہو گیا ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ان ریاستوں کے حکمران انگریزوں کی مدد کر رہے تھے۔

صوبہ بہار:

بہار اور بنگال نے اپنے مجاہدین سید احمد شہید کی تحریک کے زمانے ہی سے سندھ اور سرحد کی طرف بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ صادق پور (پٹنہ) کے مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ۱۸۵۲ء سے بہار میں مولوی احمد اللہ شاہ کی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ جنگ آزادی کے شروع ہونے سے پہلے جن لوگوں نے بہار کے عوام میں آزادی کی تڑپ پیدا کی ان میں مولانا پیر علی، مولانا یحییٰ علی، وارث علی، مولوی کریم علی، رانا کنور سنگھ، رانا امر سنگھ، کمانڈر نبی بخش، جودھر سنگھ اور حیدر علی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں پورا صوبہ ایک وسیع میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ پٹنہ اور دانا پور سے لے کر بھاگلپور ڈویژن اور راج شاہی ڈویژن تک پورا بہار انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مولانا پیر علی اور مولانا یحییٰ علی نے بہار میں گھوم پھر کر مختلف علاقوں کی انقلابی تنظیموں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا تھا۔ رانا کنور سنگھ اور رانا امر سنگھ نے اور مولوی پیر علی نے مل کر انگریزوں کو کئی مقامات پر بری طرح شکست دی۔ ان لڑائیوں میں کمانڈر نبی بخش نے بڑا نام کمایا۔ ان کا نام ایک پراسرار ہیرو، لاثانی طاقت کے مالک ایک لوہے کی لاٹ کے طور پر مشہور رہا۔

بنگال اور آسام:

بنگال کی جنگ آزادی کے واقعات پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو منگل پانڈے کو

پھانسی دی گئی تھی۔ اگر ۱۸۵۷ء کی جنگ صرف سپاہیوں کی بغاوت (غدر) ہوتی جیسا کہ انگریزوں کا دعویٰ ہے، تو منگل پانڈے کی پھانسی کے فوری بعد بغاوت شروع ہو جانی چاہیے تھی۔ لیکن انقلابی رہنماؤں نے بزورِ شمشیر آزادی حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اسے شروع کرنے کی تاریخ بھی مقرر کی تھی۔ لہٰذا منگل پانڈے کی پھانسی کے باوجود مئی اور جون تک بنگال میں کوئی بڑی شورش نہیں ہوئی۔ ۸/ اپریل کے بعد انگریزوں نے بڑی حکمت عملی سے بنگال کی مختلف فوجی چھاؤنیوں میں ہندوستانی سپاہیوں پر کڑی نگرانی رکھی اور اکثر ڈویژنوں کے ہندوستانی سپاہیوں سے ہتھیار چھین لیے۔ بنگال کے انگریز گورنر کی رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ بنگال کا کوئی علاقہ ایسا نہیں تھا جہاں بغاوت نہ ہوئی ہو۔ اسی رپورٹ سے مرشدآباد کے نواب، ڈھاکہ کے مولوی کرامت علی اور جیسور کے پولیس جمعدار محمد علی کی سرگرمیوں اور کارناموں کا پتا چلتا ہے۔"!!

آسام میں جنگِ آزادی کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی بنگال کے انگریز گورنر کی رپورٹ سے ہی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈبروگڑھ کی فرسٹ آسام لائٹ انفنٹری کے سپاہی خفیہ میٹنگ کیا کرتے تھے اور بغاوت کا منظم پلان بنا رہے تھے۔ آرہ اور جگدیش پور سے ان کے پاس خطوط آتے تھے۔ اکثر ہندوستانی فوجی افسر راجہ سارنگ سے بھی خط و کتابت کرتے تھے۔ راجہ سارنگ جس کا نام کندار پیسور سنگھ تھا وہ جورہٹ (Jorhat) میں رہتا تھا۔ اسی راجہ کے مکان میں خفیہ جلسے ہوا کرتے تھے۔ انگریز حکام کو اس سازش کی قبل از وقت اطلاع مل گئی۔ انگریزوں نے نوعمر راجہ کو گرفتار کرلیا۔ راجہ کا دیوان منی رام دت جو کلکتہ میں مقیم تھا اس کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ دیوان کو کچھ عرصے علی پور میں رکھا گیا اور پھر فروری ۱۸۵۸ء کو پھانسی دے دی گئی۔ راجہ ساری عمر علی پور جیل ہی میں رہا۔!!

پنجاب اور سندھ:

پنجاب اور سندھ میں جن لوگوں نے آزادی کا پرچم لہرایا وہ ہیں، نواب جھجر، شہزادہ محمد عظیم بیگ، نواب گوہر علی خان، صوبیدار میجر ناہر خان، مولانا عبدالقادر، راؤ تلارام، راؤ کرشن گوپال اور ست خان۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب میں سکھ حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ۱۸۴۵ء سے ۱۸۴۹ء تک مول راج اور شیر سنگھ نے انگریزوں سے متعدد لڑائیاں لڑیں۔ آخرکار فروری ۱۸۴۹ء میں سکھوں نے پوری طرح ہتھیار ڈال دیے اور پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۸۵۰ء میں پنجاب کی فوج میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا ہوئے۔ لیکن سکھ سپاہیوں کی مدد سے انگریزوں نے

بغاوت کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دیا۔ الحاق پنجاب کے بعد نابالغ دلیپ سنگھ کو لندن بھیج کر عیسائی بنایا گیا۔ راجا کی جاگیرات، عمارات اور زیورات تک کمپنی بہادر کے لٹیروں نے ہتھیا لیے۔ کوہ نور ہیرا جس پر رنجیت سنگھ نے قبضہ کرلیا تھا، انگریزوں کو لوٹ میں ہاتھ لگا۔ اُسے انگلستان بھیج دیا گیا۔

جب ملک میں جنگ آزادی کی لہر اٹھی تو سب سے پہلے میاں میر کی فوجی چھاؤنی میں بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے۔ لدھیانہ کے علما اور تھانیسر کے برہمن پنڈت اور دوسرے انقلابی پنجاب میں گھوم پھر کر عوام کو جنگ کے لیے تیار کر رہے تھے۔ پشاور، امرتسر، جہلم اور جالندھر کی فوجیں اس انتظار میں تھیں کہ میاں میر کے فوجی جب لاہور کے قلعے پر حملہ کریں تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوں گی انگریزوں کو اس بات کا پتا چلا تو سب سے پہلے میاں میر چھاؤنی کے سپاہیوں کے ہتھیار چھین لیے گئے۔ اس کے باوجود ہانسی، حصار، اور سرسہ میں شہزادہ محمد عظیم بیگ، نواب محمد علی خان اور نواب وزیر علی خان نے انگریزوں سے متعدد لڑائیاں لڑیں۔ ملتان میں صوبیدار محمد شاہ خان، لدھیانہ میں مولانا عبدالقادر، پواڑی میں راؤ تلا رام اور کوتوال راؤ کرشن گوپال اور مری پہاڑی کے انقلابی لیڈر رحمت خان نے پنجابی عوام کے جذبۂ حریت کو ابھارا اور آخر دم تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔ ۲ ستمبر ۱۸۵۷ء کو رحمت خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور انھیں ۲۴ ساتھیوں کے ساتھ توپ سے اڑا دیا گیا۔

صوبہ سندھ کا حال بھی پنجاب سے کچھ مختلف نہ تھا۔ شکار پور، کراچی، جیکب آباد اور حیدرآباد (سندھ) کے ہندوستانی سپاہیوں سے جنگ آزادی کے شعلے بھڑکتے ہی ہتھیار چھین لے گئے اس طرح سندھ میں بغاوت کو اٹھنے سے پہلے ہی دبا دیا گیا۔

صوبہ سرحد:

سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے بچے کھچے مجاہدین کا مرکز بھی صوبہ سرحد ہی تھا۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین دراصل سرحدی علاقے میں ایک آزاد مسلم ریاست کے قیام کی تحریک تھی۔ اس مقصد کے لیے سید صاحب کو پہلے سکھوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور جب پنجاب راست انگریزوں کے تسلط میں آگیا تو پھر سکھ میدان سے ہٹ گئے اور تحریک مجاہدین کا مقابلہ انگریز سامراجیت سے شروع ہو گیا۔ چناں چہ ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں: ۱۲

"اس دوران میں مذہبی دیوانوں (تحریک مجاہدین کے لوگوں کو مذہبی

دیوانے کہا جارہا ہے) نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی واقعہ تمام حالات کو واضح کر دے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم (یعنی انگریز) علاحدہ علاحدہ سول فوجی مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے۔ جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہوگئی تھی۔ اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۳ء تک ان مہمات کی گنتی ۲۰ تک پہنچ گئی تھی۔ باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ۶۰ ہزار تک ہوگئی تھی۔ بے قاعدہ فوج اور پولس اس کے علاوہ تھی۔"

۱۸۵۷ء کا انقلاب شروع ہوتے ہی انگریزوں کو سب سے بڑا خطرہ سرحد کی طرف سے تھا۔ کیوں کہ اگر اس علاقے میں ہندوستان سے اٹھنے والی آزادی کی لہر دوڑ جاتی اور سرحدی پٹھان تحریک مجاہدین کا ساتھ دیتے تو پھر انگریزوں کو بہت بڑی ناقابل شکست طاقت سے جنگ کرنی پڑتی۔ اس وقت صادق پور کے مولانا عنایت علی تحریک مجاہدین کے امیر تھے۔ وہ انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔ لہٰذا انگریزوں نے سرحد میں مختلف تحریکیں چلا کر اور غلط افواہیں پھیلا کر سرحدی پٹھانوں کو مجاہدین سے ملنے نہیں دیا۔ دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوتے ہی بنگال اور بہار سے مجاہدین کی آمد بند ہوگئی۔ ہتھیار اور روپیہ فراہم نہیں ہو پایا۔ چوں کہ پنجاب کے چھوٹے چھوٹے حکمران اور جاگیردار پوری طرح انگریزوں کے حامی تھے۔ اس لیے ہندوستان سے آنے والے رضا کاروں کو راستے کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں سرحد کے انقلابی اپنے ہندوستانی انقلابی بھائیوں سے کٹ گئے۔

انگریزوں نے سب سے پہلے ۲۱ مئی ۱۸۵۷ء کو پشاور کی فوجی چھاؤنی کے ہندوستانی سپاہیوں سے ہتھیار چھین لیے۔ بے شمار انقلابی لیڈروں کو پھانسی دے دی۔ اور عام سپاہیوں کو توپ کے سامنے کھڑے کر کے اڑا دیا۔ تحریک مجاہدین کے رہنما مولانا عنایت علی نے نارنجی کو مرکز بنا کر انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کردی۔ یکم اگست ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے بہت بڑی فوج کے ساتھ نارنجی پر حملہ کردیا اور وہاں کے مجاہدین کا صفایا کردیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے مجاہدین کے مراکز چنگلئی، پنجتار، منگل تھانہ اور ستھانہ وغیرہ پر زبردست گولہ باری کر کے ان مقامات کو زمین دوز کردیا۔

دکن اور حیدرآباد:

جب شمالی ہند میں جنگ آزادی کا بگل بج گیا تو دکن کے عوام بھی آزادیٔ وطن کی خاطر قربانی دینے

کے لیے بے چین ہو گئے۔ علما اور پنڈت یہاں بھی عوام میں بیداری پیدا کرنے کے کام میں مصروف تھے۔ رام پور کے نواب اور پنجاب کے سکھوں کی انگریز نواز پالیسی کی طرح دکن میں نظام حیدرآباد کی انگریز دوستی نے جنگ آزادی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ تاہم کولہاپور کے انقلابی شیر سال، حیدرآباد کے طرہ باز خان اور مولانا علاء الدین، مہاراجہ شولا پور اور اس کے عرب، روہیلے اور پٹھان فوجی اور راجا نرگند نے وطن دوستی کا حق ادا کر دیا۔

شولا پور کا راجا پہلے سے، نانا صاحب کی خفیہ جماعت میں شامل تھا۔ اس نے عربوں، روہیلوں اور پٹھانوں کی فوج منظم کر کے انگریزوں سے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی۔ رائے پور کے علما اور برہمن راجہ کی مدد کر رہے تھے۔ اس سرگرمی کی اطلاع ملتے ہی انگریزوں اور نظام کی مشترک فوجیں شولا پور کی طرف بڑھیں۔ راجہ نے اپنے کو کمزور دیکھ کر مقابلہ مناسب نہ سمجھا اور تنہا حیدرآباد پہنچ گیا۔ نواب سالار جنگ نے فروری ۱۸۵۷ء کو اسے گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

راجا نرگند نے اُس وقت انقلاب کا پرچم بلند کیا جب شولا پور کی بغاوت کو ختم کر دیا گیا تھا۔ مئی ۱۸۵۸ء میں اس دلیر راجا نے اپنی مختصر فوج سے انگریزوں کو شکست دی۔ لیکن اس کے بعد دوسری لڑائی میں راجا کو شکست ہوئی۔ اسے گرفتار کر کے ۱۲؍جون ۱۸۵۸ء کو پھانسی دے دی گئی۔ راجا کی ماں اور رانی نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی لیکن انگریزوں کے ہاتھ نہیں آئے۔

حیدرآباد کے غیور فرزند بھی اپنے وطنی بھائیوں کی طرح جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے بے قرار تھے۔ ۱۲؍جون ۱۸۵۷ء کو مشہور علما کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا جو مکہ مسجد اور چار مینار پر چسپاں کیا گیا تھا۔ انھیں دنوں اورنگ آباد میں ایک پیادہ رجمنٹ کے ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ گورا فوج نے باغیوں پر شدت سے گولہ باری کی۔ کچھ سپاہی بچ کر حیدرآباد بھاگ آئے۔ سالار جنگ نے انھیں گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ یہ دیکھ کر حیدرآباد کے عوام جوش اور غصے سے پاگل ہو گئے۔ اور ۱۷؍جولائی ۱۸۵۷ء کو ایک بڑا مجمع جو کئی ہزار پر مشتمل تھا۔ جو ہاتھ لگا لے کر دہلی دروازے سے باہر نکلا اور رزیڈنسی کی طرف چل پڑا۔ مولانا علاء الدین اس انقلابی گروہ کے رہنما تھے۔ ایک بہادر پٹھان جمعدار طرہ باز خان اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کر انقلابی گروہ میں شامل ہو گیا۔ اس ہجوم نے رزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ رات بھر گولہ باری ہوتی رہی۔ صبح ہونے تک ہجوم پسپا ہو کر ادھر ادھر بکھر گیا۔ طرہ باز خان کو گرفتار کرنے کے لیے مسلح فوجی دستہ روانہ کیا گیا۔ اُسے شہر کے حدود کے اندر گرفتار کر لیا گیا اور کالے پانی کی سزا دی گئی۔ لیکن وہ جیل سے فرار ہو گئے۔ انگریزی فوج نے پیچھا کیا۔ پر ان کے جنگلوں میں

انگریزوں سے مقابلہ کرتا ہوا حیدر آباد کا یہ شیر دل فرزند شہید ہو گیا۔ طرہ باز خان کی گرفتاری کے لیے انگریزوں نے پانچ ہزار روپیوں کے انعام کا اعلان کر رکھا تھا۔

وسط ہند

وسط ہند کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے رہنماؤں کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند اہم نام یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ شہزادہ فیروز شاہ، مہارانی جھانسی لکشمی بائی، نواب باندہ علی بہادر خان، محمد سعادت خان، شیخ ارادت علی، کالے خان رسالدار، محمد حسین تحصیل دار، رام چندر، رانی بیجا بائی، عبدالستار، محراب خان، لالہ جے لال، رانا کنور سنگھ، تانتیا ٹوپی اور راجا شنکر شاہ۔

وسط ہند کا تقریباً سارا علاقہ براہ راست انگریزی عمل داری میں نہیں تھا بلکہ زیادہ تر چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کا خیال ہے کہ: ۱۳

> ''اگر یہ راجپوت والیان ریاست دین کی آواز سن لیتے تو دہلی سے گجرات تک کے علاقے سے برطانوی اقتدار ختم ہو گیا ہوتا۔''

وسط ہند میں سب سے پہلے نصیر آباد کے سپاہیوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ سخت لڑائی ہوئی بہت سے انگریز افسر مارے گئے، جو بچ گئے وہ بھاگ گئے۔ آزاد فوج کے سپاہی نہایت باقاعدگی سے مارچ کرتے ہوئے دہلی روانہ ہو گئے۔ نیمچ جو نصیر آباد سے ایک سو بیس میل جنوب میں واقع ہے کے سپاہیوں نے ۳ رجون ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے اور شیخ ارادت علی کو اپنا رہنما چن لیا۔ شیخ نے ایک بڑا خیمہ لگا کر آزادی کا پرچم لہرایا اور مغل بادشاہ کی طرف سے احکامات جاری کیے۔ ماہ جون میں شہزادہ فیروز شاہ دہلی سے مندرسور پہنچ گیا اور آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں عملی طور پر شریک ہو گیا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ عوام کی ایک بڑی تعداد شہزادے کے ساتھ ہو گئی۔ جن میں اکثریت افغانی اور مکرانی تھے۔ عوامی فوج نے شہر پر قبضہ کر لیا اور فیروز شاہ کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اور ایک شخص مرزا جی کو وزیر مقرر کیا گیا۔ ریاست دھار کا راجا، اس کا دیوان رام چندر، راجا کی ماں اور چچا نے مل کر مالوہ میں آزادی کا اعلان کیا۔ فیروز شاہ نے وہاں پہنچ کر انقلابیوں کی رہنمائی قبول کر لی۔ اس کے بعد شہزادے نے قرب وجوار کی ریاستوں کو اپنے پیغام بر روانہ کیے۔ مگر سوائے جاورا کے شاہی خاندان کے ایک فرد عبدالستار کے علاوہ کسی اور نے آزاد فوج کا ساتھ دینے کا وعدہ نہیں کیا۔ جیران کے مقام پر شہزادے نے انگریزی فوج کو زبردست شکست دی۔ اور اندور سے ہوتا ہوا گوالیار پہنچ گیا۔ گوالیار کے ہندوستانی سپاہی شہزادے

کے ساتھ ہو گئے۔ انھیں لے کر اس نے دریائے جمبل پار کیا اور دھول پور فتح کر لیا۔ دھول پور میں آزاد فوج کے ہاتھ بے شمار دولت اور ہتھیار آ گئے۔ شہزادے کی ان کامیاب جنگی کارروائیوں سے اس علاقے کے مسلمانوں میں جنگ آزادی میں حصہ لینے کی آگ بھڑک اٹھی۔ دھول پور میں پچھ دن ٹھہرنے کے بعد اس نے آگے بڑھ کر آگرے کا محاصرہ کر لیا۔ دہلی سے انگریزی فوج آگرہ کو بچانے کے لیے آ گئی۔ شہزادہ وہاں سے محاصرہ اٹھا کر واپس گوالیار آ گیا۔

گوالیار کا راجہ انگریزوں کا وفادار غلام تھا۔ مگر راجا کی فوج کے اکثر سپاہیوں نے جنگ آزادی میں شرکت کا اعلان ۱۴ جون ۱۸۵۷ء کو کر دیا۔ رانی بیجا بائی بھی جس کو انگریزوں نے آجین میں قید کر دیا تھا، چھوٹ کر گوالیار کے انقلابیوں میں شامل ہو گئیں۔

یکم جولائی کو اندور میں ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ یہاں انقلابیوں کی رہنمائی محمد سعادت خان کر رہے تھے۔ فتح پور کے انقلابی ۸ جون کو باندہ پہنچے۔ باندہ کے نواب علی بہادر خان نے انقلابیوں کی رہنمائی سنبھال لی۔ راجہ شنکر شاہ جبل پور کے علاقے میں خفیہ انجمن قائم کر کے انقلاب کی تیاری کر رہے تھے۔ جب انگریزوں کو پتا چلا تو ان کی قیام گاہ کو اچانک گھیر کر راجہ کو گرفتار کر لیا اور پھر راجا شنکر شاہ اور ان کے بیٹے کو توپ سے اڑا دیا گیا۔ شنکر شاہ کے اس دردناک انجام سے ہندوستانی سپاہی غضب ناک ہو گئے اور رجمنٹ ۱۲ نے میگزین پر قبضہ کر کے اعلان جنگ کر دیا۔

۴ جون کو جھانسی کے عوام بھی میدان میں آ گئے۔ انھوں نے میگزین پر قبضہ کر لیا اور دین کی جئے کے نعرے لگاتے ہوئے فوجی چھاؤنی پر حملہ آور ہوئے۔ ہندوستانی سپاہی بھی عوام سے مل گئے۔ انگریزوں نے قلعہ میں پناہ لی۔ ۷ جون کو کالے خان رسالدار اور محمد حسین تحصیل دار کی رہنمائی میں انقلابی فوج نے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ اور انگریزوں کو جھانسی سے نکال دیا۔ اب جھانسی آزاد تھا۔ لہٰذا لکشمی بائی کی حکومت کا اعلان کیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ انقلابیوں نے یہ نعرہ بھی ایجاد کیا:

"خلقت خدا کی، ملک شہنشاہ کا اور حکومت رانی لکشمی بائی کی"

یہ دراصل اعلان تھا کہ کمپنی بہادر کی حکومت ختم ہوئی اور اس کی جگہ اب حکومت ایک مقامی حکمران کی ہے جو شہنشاہ ہند بہادر شاہ کا نمائندہ ہے۔

ماہ جون ۱۸۵۷ء سے ماہ جنوری ۱۸۵۸ء تک جھانسی آزاد رہا۔ رفتہ رفتہ ملک کے دوسرے حصوں میں جنگ آزادی کو کچلنے کے بعد جنوری ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوجیں وسطی علاقوں کی طرف

بڑھیں۔ اس وقت فیروز شاہ اور نانا صاحب اودھ میں حضرت محل اور برجیس قدر کے ساتھ دریا
جنگ کو منظم کر رہے تھے۔ ۲/اپریل ۱۸۵۸ء کو انگریزوں نے جھانسی پر قبضہ کر لیا۔ رانی لکشمی بائی
جھانسی سے نکل کر گوالیار چلی گئیں۔ یکم جون ۱۸۵۸ء کو رانی نے انگریزوں کے دوست سندھیا کی
فوج کو شکست دے کر گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸/جون کو انگریزوں نے اپنے وفادار غلام جیاجی راؤ
سندھیا کا تخت واپس دلانے کے لیے گوالیار پر حملہ کر دیا۔ پہلے دن کی لڑائی میں انگریز ناکام
رہے۔ دوسرے دن یعنی ۱۹/جون ۱۸۵۸ء کو جنگ آزادی کی آخری لڑائی گوالیار کے قلعے کے
سامنے لڑی گئی۔ اس دن ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں جرأت، ہمت، ایثار، وطن دوستی
اور عظیم قربانی کا ایک صفحہ خون شہیداں کی سرخ سرخ روشنائی سے لکھا جانے والا تھا۔ اکیس سالہ
رانی اس دن چندیری صافہ باندھے ہوئے تھی۔ جس پر خادم گل محمد نے زردوزی کا نہایت نفیس کام
کر کے اُسی دن کے لیے تیار کیا تھا مردانہ لباس میں آزادی کی متوالی دشمن کی صفوں میں گھس رہی
تھی۔ انگریزی فوج پیچھے ہٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ رانی یلغار کرتی ہوئی اپنی فوج سے دور
ہوگئی۔ پھر انگریزی فوج کا اونٹ سوار دستہ آگے بڑھا اور رانی کے باڈی گارڈ دستے اور فوج کے
درمیان آ گیا۔ آج رانی کے ساتھ اس کی دو سہیلیاں کاشی اور مندر بھی تھیں۔ یلغار کے وقت کاشی
رانی سے الگ ہوگئی۔ صرف مندر ساتھ تھی۔ سب سے پہلے مندر نے رانی پر اپنی جان نچھاور
کر دی۔ رانی نے پلٹ کر اونٹ سوار دستے پر حملہ کر دیا تاکہ راستہ بنا کر اپنی فوج سے جا ملے۔ اس
وقت ساری توپیں خاموش ہو چکی تھیں اور فضا میں سناٹا تھا لیکن طائران چمن چیخ رہے تھے کہ دیکھو
کوروکشیتر کا ایک منظر صدیوں کا فاصلہ پھلانگ کر گوالیار کے دروازے پر آ پہنچا ہے۔ ابھیمنیو کی
روح ایک بار پھر دغاباز دشمنوں کے گھیرے میں تھی۔ پھر رانی کے سر پر داہنی طرف تلوار کا ایک وار
پڑا۔ ابروئے خم دار کو کاٹتا ہوا چشم بینا میں اُتر گیا۔ پھر ایک زخم سینہ پر لگا، جوئے حیات اُبل پڑا۔
جواب میں صافے نے اپنے جگر بند کھول دیے اور جعد مشکیں کے چلمن نے قلب سعید کو ڈھانپ
لیا۔ ہندوستان کی سرزمین خون مانگ رہی تھی۔ زمین اُس وقت خون کی مانگ کرتی ہے جب
آباواجداد کی غفلت اور خود غرض بے حسی سے اس کی حرمت پامال ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ حال، سے
خون مانگ کر مستقبل کو بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ اگر حال نے وقت پر خون کی قربانی پیش نہیں کی تو
سرزمین آنے والی نسلوں کو تلپٹ کر دیتی ہے۔ ہندوستان کی وطن دوست روحیں حس باطنی سے
مالا مال تھیں سو انھوں نے وقت کی مانگ پر لبیک کہا اور اپنا خون پیش کر دیا۔ سو سال پہلے بھاگیرتی
ندی کے کنارے سراج الدولہ نے اپنا خون دیا۔ ۵۰ سال قبل کاویری کی جوشیلی لہروں کے سامنے
سلطان ٹیپو نے مسکراتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ ۲۵ سال پہلے بالاکوٹ کی بلندیوں پر سید احمدؒ
بریلوی اور سید اسماعیلؒ سلطان شہیدؒ کے نقش قدم پر چل کر جنت نشین ہوگئے اور آج رانی لکشمی بائی

نے گوالیار کی بے مہر سرزمین پر اپنا خون بہا کر شکست فاتحانہ کے علامتی ادعا کو عملی شکل دے دی۔

سردار لکشمی بائی آخری سانس لے رہی تھی۔ اُسی خادم گل محمد نے جس نے سردار کے سر کی زینت کے لیے صافہ پر زردوزی کا کام کیا تھا رانی کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اُسے بھگاتا ہوا ایک جنت کی کٹیا میں لے گیا۔ اور رانی کو گھوڑے سے اتار کر جنت کے پھوس کے بستر پر لٹا دیا۔ رانی نے آخری بار اپنی زبان کھولی اور خادم سے چند الفاظ کہہ کر دم توڑ دیا۔ رانی کی آخری خواہش کے مطابق گل محمد نے کٹیا کے سامنے گھاس پھوس کی چتا بنا کر آخری رسمیں ادا کیں اور چتا کو آگ لگا دی تاکہ رانی کے پوتر اور پاک جسم پر ناپاک دشمن کی نگاہیں تک نہ پڑ سکیں۔[15]

جنگ آزادی کی ناکامی اور اس کے اسباب:

پچھلے صفحات میں ہم نے واضح کیا تھا کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا راج ہندوستان میں بحال کرنا ہو تو اُسے سب سے پہلے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنا ضروری تھا۔ کیوں کہ جنگ آزادی دہلی سے بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کے اعلان سے شروع ہوئی تھی یعنی جنگ پلاسی کے ایک سو سال بعد مجاہدین نے کمپنی بہادر کے اقتدار کو ختم کر کے مغل اقتدار کی بحالی کا اعلان کیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو اتحادیوں کی کمزور اور منتشر عسکری قوت کا احساس تھا۔ چناں چہ انھوں نے ۲۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو جے پور، جودھپور، الور اور بیکانیر کے راجاؤں کو خطوط لکھے۔ ان خطوط اور اس کے جواب میں اُن راجاؤں کے رویے سے جنگ آزادی میں ناکامی کے اسباب پر روشنی پڑتی ہے۔ بہادر شاہ لکھتے ہیں[16]

> ''میری دلی خواہش ہے کہ فرنگی جس طرح سے بھی ہو، ہر قیمت پر ہندوستان سے نکال دیے جائیں اور ملک آزاد ہو لیکن آزادی کی جنگ اس وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب ایک قابل شخص جو تحریک کا تمام بار اپنے کاندھوں پر لے کر منتشر قوتوں کو منظم کرے اور اس بغاوت (یعنی جنگ آزادی) کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے۔ میں ذاتی طور پر حکومت کی کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ اگر تم دیسی راجگان اپنی تلواریں دشمن کو نکالنے کے لیے بے نیام کرنے کو تیار ہوں تو میں ان کے حق میں شہنشاہی سے مستعفی ہو جاؤں گا جو اس کام کے لیے منتخب ہوں (غدر کی صبح و شام: خواجہ حسن نظامی: صفحہ ۲۲۲)''

ان خطوط کا حوالہ دے کر خورشید مصطفےٰ رضوی صاحب لکھتے ہیں ''مگر ان رجواڑوں کو ملک کی غلامی

کا احساس نہ تھا۔ ستم تو یہ کہ وہ غیر جانب دار بھی نہ تھے بلکہ انگریزوں پر روپیہ اور فوج کی بارش کر رہے تھے۔ دھول پور کے راجہ نے پندرہ سو پیدل، کچھ سوار اور چھ توپیں بھیجیں۔ بیکانیر نے تین ہزار راجپوت بھرتی کر کے بھیجے۔ راجہ نالی گڑھ نے ایک ہزار گورکھے روانہ کیے۔ جموں کا راجہ بھی فوج بھیج رہا تھا۔"[۲۰] یہ ہندوستانی سپاہی تھے جنھیں مقامی رجواڑے انگریزوں کی مدد کے لیے بھیج رہے تھے۔ ان کے علاوہ ۱۱ رجون کو گوالیار کی فوج کا ایک دستہ دہلی میں مجاہدین سے کٹ کر انگریزوں سے جا ملا۔ ۲۸ رجون کو کرنل گریٹ ہیڈ (Greathed) سکھ رجمنٹ کو لے کر دہلی کے محاذ پر پہنچا۔ ۹ رجولائی کو آرٹلری رجمنٹ کے تین سو سپاہی انگریزوں کی مدد کے لیے دہلی کے محاذ پر پہنچ گئے۔ ۱۸ رجولائی کو سکھ کیولری کی ایک بڑی تعداد گولہ بارود اور سامان رسد لے کر دہلی کے محاذ پر پہنچ گئی۔ ۱۴ راگست کو نکلسن (Nicholson) ڈھائی ہزار فوج، بھاری توپیں اور اسلحہ بارود کا ذخیرہ لے کر انگریزی فوج کی مدد کے لیے دہلی پہنچ جاتا ہے۔ یکم ستمبر کو مہاراجہ کشمیر اور میرٹھ کی فوجیں انگریزوں کی مدد کے لیے دہلی پہنچ جاتی ہیں۔ ۸ رستمبر کو مہاراجہ کشمیر مزید تین ہزار ڈوگرا سپاہی انگریزوں کی مدد کے لیے دہلی روانہ کرتے ہیں۔[۲۱]

غرض ۷ رستمبر تک تمام نئی، تازہ دم اور مسلح انگریزی اور ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل فوجی دستے دہلی کے محاذ پر جمع ہو گئے اور مورچے بنانے شروع کر دیے۔ ادھر انقلابی کیمپ میں کوئی ایسا افسر نہ تھا جو تمام فوجوں کو اکٹھا کرے ان کی کمان کرتا، افراتفری اور انارکی کا عالم تھا۔ فوجی اخراجات کے لیے تقریباً ۸ لاکھ کے سرمایے کی ضرورت تھی۔ دہلی کے سرمایہ داروں نے ۳ یا ۵ لاکھ کی رقم جمع کروائی تھی لیکن وہ رقم ان شہزادوں کے جیب میں چلی گئی جو فوج کے سربراہ مقرر کیے گئے تھے۔ ان شہزادوں اور جنرل بخت خان میں شدید اختلافات تھے۔ چناں چہ صورت حال یہ تھی کہ انقلابی فوج میں ایک مضبوط اور مقتدر فوجی رہنما یعنی سپریم کمانڈر کی کمی تھی۔ دوسرے درجہ کے جو فوجی رہنما تھے وہ ناتجربہ کار اور غیر تربیت یافتہ تھے۔ فوج کا بیشتر حصہ بھی غیر تربیت یافتہ عوام پر مشتمل تھا اور جو تربیت یافتہ فوجی تھے وہ انگریزی فوج کے دیسی سپاہی تھے جن کے پاس جدید ہتھیار نہ ہونے کے برابر تھے اور اُدھر نظم وضبط اور تجربے کے لحاظ سے، جنگی سازوسامان، مالیہ اور جدید ہتھیاروں کے لحاظ سے اور ایک مضبوط ماہر جنگ مرکزی لیڈرشپ کے لحاظ سے انگریزی فوج بہت بہتر تھی اور ساتھ ہی پنجاب کے بہادر اور تربیت یافتہ سکھ، کشمیر کے ڈوگرا حکمران، وسط ہند کے راجپوت والیانِ ریاست، شمال میں نواب رام پور، گوالیار کے سندھیا اور دکن کی مملکت آصفیہ انگریزوں کی مدد روپے اور فوج سے کر رہے تھے اور طرفہ تماشہ یہ کہ دہلی میں غداروں کی ٹولی سرگرم عمل تھی جو انقلابی فوج کے حالات اور حکمت عملی کی اطلاع انگریزوں کو فراہم کر رہی تھی۔ اس ٹولی کے کچھ

لوگ انقلابی فوج کو عملی طور پر نقصان بھی پہنچا رہے تھے۔ چناں چہ ۲۶ مئی کو سلیم گڑھ کے قلعے پر نصب کی گئی توپوں میں کسی نے پتھر بھر کر انھیں ناکارہ کر دیا۔ شبہ تھا کہ یہ کام حکیم احسن اللہ خان، محبوب علی خان اور ملکہ زینت محل نے مل کر انگریزوں کی ایما پر کیا تھا۔ ۲۹ مئی کو حکیم احسن اللہ خان نے انقلابی فوج کے پانچ سو سواروں کو خواہ مخواہ میرٹھ جا کر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ انگریزوں کا ایک فوجی دستہ دریائے ہنڈن کے پل پر ان سپاہیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک حملہ کر کے انگریزوں نے ان پانچ سو سواروں کا خاتمہ کر دیا۔ ۸ راگست کو دہلی میں انقلابی فوج کے بارود کے کارخانے کو تباہ کر دیا گیا۔ بارود کے کارخانے کے داروغہ رجب علی نے انگریزوں کی شہ میں اس مکروہ کام کو انجام دیا تھا۔

ان نامساعد حالات کے باوجود انقلابی فوج، اس کے رہنما اور خاص طور پر علمائے وطن اور ملک کو آزاد کرانے کے لیے جو قربانیاں دی ہیں وہ ہماری تاریخ کا ایک قابل فخر باب ہے۔ غداروں کی ٹولی کی منافقانہ مذموم حرکتوں کے باوجود مجاہدین نے دہلی کو آسانی سے انگریزوں کے حوالے نہیں کیا۔ ۱۴ر ستمبر کی صبح ۸ بجے انگریزی فوج نے دہلی پر یلغار کی۔ ۱۵ر ستمبر کو انگریزی فوجیں تین طرف سے دہلی میں داخل ہوئیں اور چار دن کی گھمسان لڑائی کے بعد ۱۹ر ستمبر کو شہر، قلعہ اور شاہی محل پر انگریزی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ شہر اور قلعہ میں موجود زخمی سپاہیوں کا ہوا کن کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل عام ہوا۔ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ ابھی دہلی پوری طرح سے فتح نہ ہوئی تھی اور نہ مغل اقتدار کی شمع گل ہوئی تھی۔ ابھی آزادی حاصل کرنے کے امکانات تھے کیوں کہ سارے ہندوستان نے مغل اقتدار اور آزادی کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا تھا۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہم جنرل بخت خان اور بہادر شاہ کی گفتگو کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ۱۹ر ستمبر کی رات کو جنرل بخت خان، بہادر شاہ کے پاس آئے، ان کو ہمت دلائی اور کہا۔[۱۸]

"اگر چہ کہ انگریزوں نے دہلی کو لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ تمام ملک ہمارے ساتھ ہے۔ ہر شخص کی نظر آپ کی ذات پر لگی ہوئی ہے۔ آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔ میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ایسی مورچہ بندی کروں گا کہ انگریزوں کا فرشتہ بھی نہ آ سکے گا۔ دہلی پایہ تخت ہے۔ فوجی قلعہ نہیں ہے۔ لڑائیوں کے لیے ایسے مقامات مناسب نہیں ہوتے۔ چند مہینے جو ہم نے مقابلہ کیا ہے یہ بھی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمارا شہر نشیب میں تھا اور انگریز پہاڑی پر کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی جیسے مضبوط مورچے پر ہوتی تو فتح دشوار نہ تھی۔ پھر سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ حضور کے صاحب زادے مرزا مغل کمانڈر انچیف بنا دیے گئے۔ وہ لڑائی کے فن سے ناواقف تھے۔ اگر وہ میرے کاموں میں رخنہ نہ ڈالتے اور میرے منصوبوں میں حارج نہ ہوتے تو

یقیناً اس خود سر فوج سے دشمن کو شکست دیتا۔ ہم کو آپس کے بگاڑ اور ایک دوسرے پر بھروسہ نہ کرنے کے سبب وہ قوتیں جو دشمن کے مقابلے میں صرف ہوتیں، خانگی جھگڑوں میں بے کار ضائع کرنا پڑیں مگر اب بھی کچھ نہیں گیا — تمام ہندوستانی ریاستیں چپ چاپ بیٹھی ہیں۔ جس وقت ہمارا پلہ ذرا بھی بھاری ہوگا وہ ہماری مدد کے لیے اُٹھ کھڑی ہوں گی۔۔۔ آپ یقین کیجیے کہ اگر آپ محفوظ مقامات سے انگریزوں کا مقابلہ کریں گے تو تمام ملک ساتھ دے گا، آدمی، رسد، ہتھیار اور روپیہ ہم کو اس افراط سے مل سکتے ہیں کہ انگریز اپنے ملک کے بچے بچے کو ہم پر چڑھا لائیں تب بھی ہم صدیوں تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جہاں پناہ کے سامنے یہ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے کہ حضور کے باپ دادا نے اس سے بڑھ بڑھ کر شکستوں اور ناکامیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ (دہلی کی جانکنی۔ خواجہ حسن نظامی صفحہ ۳۸،۳۷)

بہادر شاہ بخت خان کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور اگلے دن ہمایوں کے مقبرے میں اُن سے ملاقات کرنے کو کہا۔ انگریزوں نے مرزا الٰہی بخش کو بہادر شاہ پر مسلط کر دیا تھا۔ الٰہی بخش کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ بہادر شاہ کو انقلابی فوجوں کے ساتھ دہلی سے باہر نہ جانے دے۔ الٰہی بخش منشی رجب علی کے ذریعہ تمام خبریں انگریزی کیمپ پہنچا رہا تھا۔ بخت خان کی گفتگو کے بعد وہ بہادر شاہ کے پاس آیا۔ بڑھاپے کا احساس دلایا۔ برسات کے موسم کی تکالیف کا ذکر کیا۔ شہزادوں، شہزادیوں اور بیگمات کی تکلیفوں کا نقشہ کھینچا۔ انگریزوں سے گفتگو کر کے شاہی خاندان کی حفاظت اور جان بخشی کی ذمہ داری لی۔ بہادر شاہ یہ باتیں سن کر خاموش ہو گئے، کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ الٰہی بخش نے ساری باتوں کی اطلاع انگریزوں کو دے دی۔ اُس کو حکم ملا کہ ۲۴ گھنٹے بادشاہ کو روکے رکھے باہر جانے نہ دے۔ دوسرے دن بخت خان بہادر شاہ سے ملے، بہت دیر تک بحث و تکرار رہی۔ بہادر شاہ جانا چاہتے تھے مگر الٰہی بخش انھیں روک رہا تھا۔ بخت خان نے جب اصرار کیا تو الٰہی بخش نے نہایت تلخ انداز سے کہا۔ ''لارڈ گورنر صاحب! کل آپ نے فرمایا تھا کہ میں حضور کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھوں گا تو کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جہاں پناہ کی آڑ میں آپ خود حکومت کرنا چاہتے ہیں — آپ مغلوں سے صدیوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں — میں جانتا ہوں آپ پٹھان ہیں اور پٹھان سیکڑوں برس تک کینے کو نہیں بھولتے۔'' یہ بے ہودہ گفتگو سن کر بخت خان نے اپنی تلوار پر ہاتھ ڈالا اور قریب تھا کہ اس کا سر اڑا دے مگر بادشاہ نے روک دیا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو بخت خان مایوس ہو کر چلے گئے۔ الٰہی بخش نے انگریزوں کو اطلاع دے دی۔ دوسرے دن ہڈسن بہادر شاہ کو گرفتار کرنے کے لیے ہمایوں کے مقبرے میں پہنچ گیا۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے جان بخشی کے وعدے پر خود کو ہڈسن کے حوالے کر دیا اور ساتھ ہی مغل اقتدار کا

چراغ گل ہو گیا اور حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ۱۹

اس وقت جنگ کے شعلے سارے ہندوستان میں بھڑک رہے تھے۔ خاص طور پر روہیل کھنڈ، اودھ اور وسط ہند میں سارے انقلابی لیڈر بہادر شاہ ظفر کو حاکم اعلیٰ مان کر میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ایسے میں اگر بہادر شاہ شاہی خاندان اور جنرل بخت خان کو لے کر روہیل کھنڈ یا وسط ہند کے پہاڑی علاقے میں پہنچ جاتے تو اس بات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ جنگ کی کیا صورت ہوتی۔ عین ممکن ہے کہ وہ سب کچھ جنرل بخت خان کے ہاتھوں ہو جاتا جس کا اظہار انھوں نے ۱۹ ستمبر کی شام بہادر شاہ سے گفتگو کے دوران کیا تھا۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا درد ہے جس کے اظہار کے لیے ایک الگ اور مختلف نوعیت کے تجزیے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ جہاں ہزاروں افراد نے آزادیٔ وطن کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی دی وہیں سیکڑوں ایسے غدار بھی پیدا ہوئے جو دولت اور اقتدار کی ہوس میں دشمنوں سے ساز باز کرنے میں کوئی عار نہیں محسوس کیا۔ الٰہی بخش انھیں میں کا ایک سیاہ باطن کردار ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے غاصبانہ اقتدار اور ظلم و ستم کا مقابلہ کرنے کے لیے جن لوگوں نے تلوار اٹھائی ان میں جہاں سراج الدولہ، حیدر علی، ٹیپو سلطان، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، سید احمد اللہ شاہ، جنرل بخت خان، نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، شہزادہ فیروز شاہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولوی عظیم اللہ خان، علی نقی خان، بیگم حضرت محل اور رانی جھانسی جیسے جانباز موجود تھے وہاں ہر دور میں غداروں کا ایسا طبقہ بھی موجود رہا جو آستین کے سانپ کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگر غداروں کی جماعت ایک طرف براہ راست انگریزوں کی عسکری مدد اور دوسری طرف شاہی دربار اور مجاہدین کا اعتماد حاصل کر کے ان کی جنگی مشاورتی کونسل میں شامل ہو کر ان کے منصوبوں کی اطلاع انگریزوں کو فراہم نہ کرتی تو اس جنگ کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ اپنی عسکری قوت کی برتری کی بنا پر نہیں کیا ہے بلکہ سازشوں اور جاسوسی کے بہتر نظام کے بل پر کیا تھا۔ خاص طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی کامیابی میں چند بااثر اور بہتر عسکری قوت والے دیسی والیانِ ریاست کی مدد اور غداروں کی ٹولی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ والیانِ ریاست میں پنجاب کی ریاستیں، کشمیر کے ڈوگرہ حکمران گلاب سنگھ ابتدا ہی سے انگریزوں کی مدد کرتے رہے۔ بعض نے انگریزوں کا پلڑا بھاری ہونے کے بعد ان کا ساتھ دیا۔ جیسے جیاجی راؤ سندھیا، نواب رام پور، وسط ہند کے راجپوت اور حیدر آباد دکن کے افضل

الدولہ اوران کے وزیرسالار جنگ۔ متعدد انگریز مورخوں نے اعتراف کیا ہے کہ اگر پنجاب، وسط ہند اور دکن انگریزوں کا ساتھ نہ دیتے تو کمپنی بہادر کی حکومت ۱۸۵۷ء میں ختم ہو جاتی۔

غداروں کے شرمناک جاسوسی کارناموں کے بارے میں ایک اہم کتاب ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ جناب سلیم قریشی اور مشہور شاعر عاشور کاظمی صاحبان نے انڈیا آفس لائبریری سے غداروں کے خطوط جمع کر کے ''اس گھر کو آگ لگ گئی'' کے عنوان سے یہ کتاب شائع کی ہے۔جس سے جنگ آزادی کی ناکامی کا نیا زاویہ سامنے آتا ہے۔اس کتاب کے ایک اقتباس سے غداروں کے شرمناک کارناموں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔[۲۰]

''میر صادق، میر غلام علی اور دیوان پورنیا جیسے غدار نہ ہوتے تو ناممکن نہ تھا کہ ٹیپو سلطان ہی اپنی فوجی طاقت کے بل پر پوری انگریزی فوج کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو فتح اپنی طاقت کے بل پر نہیں بلکہ مرزا الٰہی بخش، مولوی رجب علی، گوری شنکر، جیون لال، تراب علی، مان سنگھ، لطافت علی، جواہر سنگھ، امی چند، میر محمد علی، محبوب خان، ہرچند، پربھو، میگھ راج، رستم علی، راجن گوجر وغیرہ کی جاسوسی اور وطن دشمنی کی وجہ سے ہوئی۔''

عاشور کاظمی صاحب ۔ نے جان ولیم کے (Sir John William Kaye) کی کتاب (Spoy War in India) سے ایک اقتباس دیا ہے:[۲۱]

> ''حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہماری بحالی کا سہرا ہمارے ہندوستانی پیروکاروں کے سر ہے جن کی ہمت و جسارت نے ہندوستان کو اپنے ہم وطنوں سے لے کر ہمارے حوالے کر دیا۔''

''اس گھر کو آگ لگ گئی'' میں غداروں کے ۱۴۷ خطوط ہیں۔سارے کے سارے خطوط بے حد اہم ہیں۔اس لیے قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔

جنگ آزادی کے ہیرواوران کا انجام:

بہادر شاہ ظفر اور مغل شہزادے: جنگ آزادی میں جس خاندان نے سب سے عظیم قربانی دی ہے وہ مغل خاندان ہے۔ بہادر شاہ پر بغاوت کا الزام لگا کر مقدمہ چلایا گیا۔ کمپنی نے جب حکومت حاصل کی تو عوام کو یہ باور کرایا تھا کہ ملک شہنشاہ کا ہے اور حکم کمپنی کا چلتا ہے۔یعنی کمپنی تسلیم کرتی تھی اصل حکمران تو مغل بادشاہ ہے اور شہنشاہ کی اجازت سے وہ حکومت کر رہی ہے۔ کیوں کہ برعکس کی

اس کے بعد کمپنی نے مغل بادشاہ سے دیوانی کی سند حاصل کر لی تھی۔ قانوناً کمپنی مغل بادشاہ کی دیوان یعنی چیف ریونیو آفیسر تھی۔ ۱۸۵۷ء میں شہنشاہ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے کمپنی کو برخواست کر دیا تھا یعنی اب کمپنی باغی تھی اور اقتدار مغل شہنشاہ کا تھا۔ لیکن طاقت کے بل پر کمپنی نے بہادر شاہ کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور جرم ثابت کر کے شہنشاہ ہند کو جلاوطن کر دیا۔

مغل شہزادوں کو گرفتار کرنے سے پہلے جان بخشی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ کمپنی نے اس وعدہ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ گرفتاری کے فوری بعد سارے شہزادوں کو قتل کر دیا گیا۔ چناں چہ جنگ کے ابتدائی دور میں ہی مغل نسل کے آخری چراغوں نے ملک کو بچانے کے لیے اپنا خون دیا۔ انھیں کے نقش قدم پر چل کر مہارانی جھانسی نے بھی اپنی جان قربان کر دی۔ انجام کار اس ملک کی مٹی میں دونوں خون شامل ہیں۔ ایک دوسرے میں خلط ملط ہو چکے ہیں۔ انھیں اب کوئی جدا نہیں کر سکتا۔

نانا صاحب: جنوری ۱۹۵۹ء میں بچی کھچی انقلابی فوجیں اور مجاہدین جن کی تعداد ۷۰ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اودھ سے نکل کر نیپال کی طرف چلے گئے۔ خیال ہے کہ ان میں نانا صاحب بھی تھے۔ ان کی آخری زندگی کے بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں معلوم ہے۔ ان کے خاندان کی کچھ خواتین گوالیر واپس آئی تھیں اور کچھ نیپال میں رہ گئیں۔ انگریزوں نے ان کی گرفتاری کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اکتوبر ۱۸۶۲ء میں افواہ اڑی تھی کہ وہ بھوٹان کی پہاڑیوں میں روپوش ہیں۔

مولانا احمد اللہ شاہ: مولانا کا پورا نام سید احمد علی عرف ضیاالدین اور خطاب دلاور جنگ تھا۔ جلال الدین عادل کے پوتے اور ابوالحسن تانا شاہ والی گولکنڈہ کے پرپوتے تھے۔ والد ایک معزز رئیس اور سلطان ٹیپو شہید کے درباری تھے۔ ابتدا میں ریاست حیدرآباد کی فوج میں خدمات انجام دیں پھر لندن چلے گئے۔ مولانا نے ایک سال تک اودھ میں انگریزوں کو داخل ہونے نہیں دیا۔ جب انگریز اودھ پر قابض ہو گئے تو مولانا نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا اور قصبہ محمدی میں آزاد حکومت قائم کی۔ نانا صاحب دیوان بنائے گئے۔ جنرل بخت خان وزیر دفاع اور مولانا سرفراز علی قاضی القضاۃ۔ مولوی لیاقت علی، مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خان کونسل کے اراکین مقرر ہوئے۔ قصبہ محمدی میں حکومت قائم ہوئے چند دن ہی گزرے تھے کہ انگریزوں نے محمدی پر حملہ کر دیا۔ مولانا نے پوائین کے راجہ سے مدد طلب کی۔ راجہ نے مدد کا وعدہ کر کے مولانا کو ملاقات کی دعوت دی۔ مولانا چند ساتھیوں کو لے کر پوائین پہنچ گئے۔ جب قلعہ کے قریب پہنچے تو ان کو حیرت ہوئی کہ دروازہ بند ہے اور اس پر مسلح پہرہ ہے۔ پوائین کے راجہ جگن ناتھ سنگھ اپنے بھائی کے ہمراہ پہرے والوں کے درمیان دروازے کے اوپر فصیل پر موجود تھا۔ مولانا نے دروازہ کھلوانے کی کوشش کی تو

جواب میں اوپر سے گولیاں چلائی گئیں۔ مولانا نے اپنے ساتھیوں کو دروازہ توڑنے کا حکم دیا۔ اس وقت راجہ کے بھائی بلدیو سنگھ نے اوپر سے گولی چلائی اور مولانا احمد اللہ شاہ جنگ آزادی کا روح رواں اور مجاہد اعظم شہید ہو گیا۔[۴۲]

راجہ اور اس کا بھائی دروازہ کھول کر باہر آئے۔ مولانا کے سر کو تن سے جدا کر کے شاہ جہاں پور کی انگریز فوجی چھاؤنی میں پہنچایا گیا۔ اگلے دن مولانا کا جسم عام پبلک کے سامنے جلا کر راکھ دریا میں بہادی گئی۔ راجہ کو اس خدمت کے صلے میں ۵۰ ہزار روپیہ کا انعام جو مولانا کی گرفتاری کے لیے مقرر کیا گیا تھا دیا گیا۔ بعد ازاں مولانا کے سر کو لے کر شاہ جہاں پور میں دفن کیا گیا۔ مولانا کی شہادت کے بعد اودھ اور وسط ہند میں نئے سرے سے بے شمار بغاوتیں ہوئیں اور کئی ماہ تک ہوتی رہیں۔

جنرل بخت خان: جنرل بخت دیگر رہنماؤں کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ دوسری روایت یہ بھی ہے کہ وہ ۱۳ مئی ۱۸۵۹ء کو ایک جنگ میں شہید ہوئے۔ بعض انگریز مورخ کہتے ہیں وہ نہ انگریزوں کے ہاتھ آئے اور نہ ان کی کوئی خبر ملی۔

بیگم حضرت محل اور برجیس قدر: بیگم حضرت محل اپنے بیٹے کے ساتھ نانا صاحب کے ہمراہ نیپال چلی گئیں۔ ۱۸۷۹ء میں بیگم حضرت محل کا انتقال ہو گیا۔ کھٹمنڈو کی ایک ویران مسجد میں ان کا مزار ہے۔ ماں کے انتقال کے بعد برجیس قدر ۱۸۹۳ء میں کلکتہ آ گئے۔ ان کا خاندان کلکتہ میں آباد ہو گیا۔

شہزادہ فیروز شاہ: جنگ آزادی میں شہزادہ فیروز شاہ کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ خورشید مصطفیٰ رضوی صاحب نے ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کے حوالے سے یہ اقتباس دیا ہے۔ "اس وقت (یعنی ۱۸۵۷ء) سے ایک صدی پہلے اُس جیسی صلاحیتوں کا مالک انسان یقیناً ایک عظیم سلطنت فتح کرتا اور اس دور سے ایک صدی بعد اگر وہ جنم لیتا تو آج کا ہر دل عزیز رہنما بنتا۔ اس طرح وہ یا تو اپنے وقت سے بہت بعد پیدا ہوا یا بہت پہلے ...... سب سے زیادہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج اس کے صرف چند ہم وطن اسے یاد رکھ سکے ہیں۔"

جب جنگِ آزادی کے رہنما نیپال چلے گئے تو شہزادہ فیروز شاہ اپنے دو ہزار ساتھیوں کو لے کر ان سے الگ ہو گیا۔ گنگا پار کر کے وہ پھرتے پھراتے اُروَنی کے جنگلات میں پناہ گزین ہو گیا۔ ۱۸۶۰ء میں وہ ایران چلا گیا۔ ۱۸۶۱ء میں اس کے بخارا پہنچنے کی خبر ملتی ہے۔ ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء میں وہ تہران میں تھا۔ جون ۱۸۷۵ء میں مکہ معظمہ چلا گیا۔ اسی مقدس سرزمین پر ۱۷ دسمبر ۱۸۷۷ء کو شہزادے کا انتقال ہو گیا۔ آخری ایام میں وہ شریف مکہ کے جاری کردہ وظیفہ پر گزارا کر رہا تھا۔ اپنی یادگار جو اس نے مکہ معظمہ میں چھوڑی وہ ایک غم زدہ عورت اس کی بیوی تھی۔

خان بہادر خان: باندہ کے نواب، روہیل کھنڈ کے جوشیلے انقلابی لیڈر۔ ۱۸۵۹ء تک گوریلا جنگ کرتے رہے۔ ایک دست بہ دست لڑائی میں زخمی ہو کر گرفتار ہوئے۔ انھیں ۱۸۶۰ء میں بریلی کی پرانی کوتوالی کے سامنے پھانسی دے دی گئی۔

مولوی لیاقت علی: انقلابی لیڈروں کے ساتھ پہلے نیپال چلے گئے۔ ۱۸۵۹ء میں ہندوستان واپس آئے۔ ۱۸۶۹ء میں سچالی کے ریلوے اسٹیشن سے پولیس نے انھیں گرفتار کر لیا۔ بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلا کر انھیں کالے پانی کی سزا دی گئی اور وہیں ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔

عظیم اللہ خان: عظیم اللہ خان جنگ آزادی شروع ہونے کے بعد برابر نانا صاحب کے ساتھ رہے۔ تمام جنگوں میں حصہ لیا۔ ۲۱ مارچ کو انگریزوں نے جب لکھنؤ فتح کر لیا تو تمام لیڈروں کے ساتھ عظیم اللہ خان نے بھی لکھنؤ چھوڑ دیا۔ اس جنگ کے بعد عظیم اللہ خان کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ آیا وہ اس جنگ میں شہید ہوئے یا نانا صاحب کے ساتھ جنوری ۱۸۵۹ء میں نیپال چلے گئے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی: دہلی کی فتح کے بعد مولانا اپنے خاندان کو لے کر یہاں سے نکل گئے۔ دو سال تک خانہ بدوش زندگی گزاری۔ جب وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا تو باہر نکل آئے۔ انگریزوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔ لکھنؤ میں مقدمہ چلایا گیا اور کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ساری زندگی وہیں گزاری۔ ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔

گلزار علی اور شبیر علی: امروہہ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے سید شبیر علی کو گرفتار کر لیا اور مقدمہ چلا کر ۱۸۵۹ء جلاوطن کر کے انڈمان بھیج دیا جہاں انھوں نے ۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ سید گلزار علی فرار ہو گئے۔ انگریزوں کے ہاتھ نہیں آئے۔

شہزادہ عظیم بیگ: شہزادہ عظیم بیگ احمد شاہ درانی کا بیٹا تھا۔ حصار اور ہانسی کی جنگ میں نواب وزیر خان کے ساتھ تھا۔ انگریزوں نے نواب وزیر خان کو شکست دے کر ان کو اور ان کے سارے خاندان کو حصار میں پھانسی دے دی تو شہزادہ عظیم بیگ ستمبر ۱۸۵۷ء میں دہلی چلا گیا۔ پھر انقلابی فوجوں کے ہمراہ بریلی اور لکھنؤ چلا گیا اور آخر دم تک حضرت محل کے ساتھ رہا۔

نواب وزیر خان: حصار کی جنگ کے رہنما۔ حصار اور ہانسی کی جنگ کے شکست کے بعد انگریزوں نے انھیں اور ان کے سارے خاندان کو پھانسی دے دی۔

دل بخش کاکوروی: اودھ میں جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد گوریلا جنگ کی تیاری کر رہے تھے، انگریزوں کو پتہ چل گیا۔ انھیں اٹھارہ ساتھیوں کے ساتھ پھانسی دے دی گئی۔

نواب ولی داد خان: مغل خاندان سے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے انھیں بلند شہر کا حاکم مقرر کیا تھا۔ بریلی پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد خان بہادر خان کے ساتھ نیپال چلے گئے۔

تانتیا ٹوپی مشہور مرہٹہ سردار: ۷ اپریل ۱۸۵۹ء کو گوالیار میں گرفتار کیے گئے اور ۱۸ اپریل کو پھانسی دے دی گئی۔ گرفتاری کے وقت وہ گوالیار سے نکل کر شہزادہ فیروز شاہ کے پاس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وزیر مان سنگھ کی غداری سے انگریزوں کو ان کے بارے میں اطلاع ملی۔ پھانسی سے پہلے تانتیا نے اپنا مفصل بیان اور حالات اردو میں لکھوائے اور آخر میں اپنے دستخط مرہٹی میں کیے۔ گوالیار سے نکل کر وہ ناگپور سے ہوتے ہوئے مدراس جانا چاہتے تھے۔ اس بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ "وہ ہمارے لیے اتنا ہی خطرناک ثابت ہوا جتنا کہ حیدر علی کسی وقت ہو چکا تھا۔"

راؤ تلارام: راؤ صاحب نے بہادر شاہ ظفر اور آزاد فوج کے لیے روپیہ اور رسد کثیر مقدار میں فراہم کیا۔ ۱۸۶۳ء میں فیروز شاہ کے ساتھ تھے جب وہ ایران اور ہرات کا دورہ کر رہا تھا۔ اس کے بعد کا پتہ نہیں راؤ صاحب کہاں گئے۔

حکیم چندجی اور مرزا شیر بیگ: ہانسی، حصار اور روہتک کی جنگوں میں حصہ لیا۔ جب انگریزوں نے ہانسی پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو حکیم چندجی اور مرزا شیر بیگ کو پھانسی دے دی گئی۔

راجہ بنی مادھو سنگھ: بیگم حضرت محل کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ انھوں نے اپنی عورتوں کو ہدایت دی تھی کہ وہ آخر دم تک بیگم حضرت محل کی رفاقت سے منہ نہ موڑیں۔ ۱۸۵۹ء میں ایک لڑائی میں میدانِ جنگ میں مارے گئے۔

دیوان حکمت اللہ: فتح پور کے ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ نانا صاحب کے ساتھ ہر جنگ میں شریک رہے۔ فتح پور میں گرفتار کیے گئے اور وہیں پھانسی دی گئی۔ ولیم میور نے لکھا ہے کہ پھانسی سے پہلے حکمت اللہ صاحب کے منہ میں سور کا گوشت ٹھونسا گیا تھا۔

راجہ ہنومنت سنگھ: کالاکنکر کے تعلقہ دار ہنومنت سنگھ بھی بیگم حضرت محل کے ساتھ اور اودھ کے جان نثاروں میں تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کی شہادت کے بعد جو انقلابی سردار انتقام لینے کے لیے میدان میں آئے، اُن میں راجہ ہنومنت سنگھ پیش پیش تھے۔

محمد شفیع: بریلی کے رسالدار بخت خان کے ساتھی آخر دم تک انگریزوں سے لڑتے رہے۔ بخت خان کے بعد وہ خان بہادر خان کے ساتھ رہے۔ ان کے بارے میں مزید معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

احمد خان کھرل: ملتان کے احمد خان کھرل بہت بہادر انقلابی سردار تھے۔ ۲۱ رجنوری ۱۸۵۸ء کو انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

جمعدار طرہ باز خان: ۱۹ رجولائی ۱۸۵۷ء کو طرہ باز خان نے اپنی جمعیت کے ساتھ حیدرآباد میں انگریز ریذیڈنٹ کی کوٹھی پر حملہ کر دیا۔ پسپائی کے بعد وہ زخمی حالت میں گرفتار ہوئے۔ جیل سے فرار ہو کر پران (عادل آباد) کے جنگلوں میں پناہ لی۔ وہیں انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

راجا کنور سنگھ اور راجا امر سنگھ: بہار میں جگدیش پور ریاست کے راجہ راجا کنور سنگھ نے ۸۰ سال کی عمر میں جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ میدان جنگ کے سپاہی اور سالار کی حیثیت سے ان کا نام بہت عظیم ہے۔ انگریزوں کو کئی مشہور لڑائیوں میں شکست دی۔ ایک لڑائی میں زخمی ہوئے اور ۲۶ اپریل ۱۸۵۸ء کو انتقال کیا۔ بھائی کے انتقال کے بعد راجا امر سنگھ نے جگدیش پور کو بچانے کے لیے دو بڑی لڑائیاں لڑیں۔ اپنے تمام سپاہیوں کو کھو کر وہ بچتے جگدیش پور سے نکل کر چلے گئے۔ جنرل بخت خان کی طرح پھر امر سنگھ کی کوئی خبر نہیں ملی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہمت، بہادری اور حوصلہ مندی کے بے شمار واقعات ہیں جنھیں بیان کرنے کے لیے ایک علاحدہ کتاب چاہیے اور ایسے دلیروں کی تعداد غالباً ہزاروں تک پہنچ جائے گی۔ یہاں ہم نے صرف چند رہنماؤں کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر تاریخ کے صفحات پر ملتا ہے۔ لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کا ذکر تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتا۔

(نوٹ: بیشتر معلومات خورشید مصطفےٰ رضوی صاحب کی کتاب ''جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون'' سے لیے گئے ہیں۔ شکریہ کے ساتھ)

لہو ترنگ

☆ شکیب جلالی

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے شہیدوں کی یاد میں!

(پہلی آواز)

ہمیں قبول نہیں زندگی اسیری کی
ہم آج طوق و سلاسل کو توڑ ڈالیں گے
ہمارے دیس پہ اغیار حکمراں کیوں ہوں
ہم اپنے ہاتھ میں لوح و قلم سنبھالیں گے
فضا مہیب سہی، مرحلے کٹھن ہی سہی
سفینہ حلقۂ طوفاں سے ہم نکالیں گے
نقوشِ راہ اگر تیرگی میں ڈوب گئے
ہم اپنے خوں سے ہزاروں دیے جلالیں گے

(دوسری آواز)

جو لوگ لے کے اٹھے ہیں علم بغاوت کا
انھیں خود اپنی ہلاکت پہ نوحہ خواں کردو
بجھاؤ گرم سلاخوں کو ان کی آنکھوں میں
زبانیں کھینچ لو گدی سے، بے زباں کردو
ہدف بناؤ دلوں کو سلگتے تیروں کا
سناں سے جسموں کو چھیدو، شکستہ جاں کردو
گلِ سرا کی حدوں تک کوئی پہنچ نہ سکے
ہر ایک گام پہ ایستادہ سولیاں کردو

(پہلی آواز)

یہ غم نہیں کہ سرِ دار آئے جاتے ہیں
ہمیں خوشی ہے، وطن کو جگائے جاتے ہیں
ہمارے بعد کبھی رات ڈھل تو جائے گی
دلوں میں شمعِ جنوں تو جلائے جاتے ہیں
ہمارے نقشِ قدم دیں گے منزلوں کا سراغ
ہمیں شکست نہ ہوگی، بتائے جاتے ہیں
جواں رہیں گی ہمارے لہو کی تحریریں
سدا بہار شگوفے کھلائے جاتے ہیں

حوالہ جات

۱- جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: صفحہ ۱۱: خورشید مصطفےٰ رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس، دہلی طبع اوّل اپریل ۱۹۵۹ء (ناشر: مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد، دہلی ۶)

2. *The Indian war of independence of 1857: By V.D.Savarkar: Printed in the book : India in 1857: Edited by Ainslie T.Embree: P.83 to 93:Chanakya Publication F-10/14:Model Town,Delhi 110009-1987.*

۳: جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: صفحہ ۱۵۲: خورشید مصطفےٰ رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی طبع اوّل، اپریل ۱۹۵۹ء

۴: ایضاً: صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۳

۵- ایضاً صفحہ ۱۲۴ تا ۱۲۷

۶- آزادی کی کہانی انگریزوں اور اخباروں کی زبانی: صفحہ ۵۷: غلام حیدر: مطبوعہ: نیوڈیا آرٹ پرنٹرس: نئی دہلی: مارچ ۱۹۸۷ء

۷- جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: صفحہ ۱۸۴: خورشید مصطفےٰ رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی: طبع اوّل ۱۹۵۹ء

۸- فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس: صفحہ ۳۳: وبھوتی نارائن رائے (مترجم: معصوم مرادآبادی) مطبوعہ: خبردار پبلی کیشنز۔ دہلی۔ پہلا اڈیشن ۲۰۰۲ء

۹- جنگ آزادی اٹھارہ سوستاون: صفحہ ۲۵۰: خورشید مصطفےٰ رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس، دہلی طبع اوّل ۱۹۵۹ء

۱۰- ایضاً۔ صفحات: ۲۸۷ اور ۲۹۱

۱۱- ایضاً۔ صفحات ۳۶۴ اور ۳۶۸

۱۲- ہمارے ہندوستانی مسلمان: صفحہ ۳۳: ڈبلیو۔ڈبلیو ہنٹر (ترجمہ: ڈاکٹر صادق حسین) مطبوعہ

الکتاب انٹرنیشنل مرادی روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، بار اوّل، جون ۲۰۰۲ء

۱۳- جنگِ آزادی اٹھارہ سو ستاون: صفحہ ۳۷۹: خورشید مصطفےٰ رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی، طبع اوّل ۱۹۵۹ء

۱۴- ایضاً: صفحہ ۳۹۱

۱۵- ایضاً: صفحہ ۴۰۰

۱۶- ایضاً: صفحہ ۱۹۶

۱۷- اس گھر کو آگ لگ گئی: صفحہ ۷۷، ۷۸، ۸۰، ۸۱ اور ۸۲۔ سید عاشور کاظمی اور سلیم قریشی: مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی: اشاعت اوّل ۱۹۹۳ء

۱۸- جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون: صفحہ ۲۰۳، خورشید مصطفےٰ رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی، طبع اوّل ۱۹۵۹ء

۲۰- اس گھر کو آگ لگ گئی، صفحہ ۱۰: سید عاشور کاظمی اور سلیم قریشی: مطبوعہ: انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، اشاعت اوّل ۱۹۹۳ء

۲۱- ایضاً: صفحہ ۳۶

۲۲- جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون، صفحہ ۳۲۴: خورشید مصطفےٰ رضوی: مطبوعہ الجمعیۃ پریس (دہلی) طبع اوّل ۱۹۵۹ء

۲۳- ایضاً صفحہ ۳۳۳

ساتواں باب:

جنگ آزادی اور ہندوستانی علماء

۱- مابعد جنگ آزادی: منظر نامہ

۲- ماقبل جنگ آزادی: علماء کی سرگرمیاں

۳- علمائے عظام جنھوں نے جنگ آزادی میں عملی حصہ لیا

۴- حوالہ جات

مابعد جنگ آزادی: منظر نامہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے بہ حیثیت مجموعی جس شدت سے انگریز مخالفت کا ثبوت دیا تھا۔ اس سے انگریزوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ انگریز اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمان سب سے بہتر قوم ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب لکھتے ہیں ؎

''حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکومت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے۔''

اور مسلمانوں نے اس دعویٰ کا مکمل ثبوت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دیا تھا۔ جنگ آزادی سے پہلے حکمراں طبقے نے سیاسی اقتدار کھو دیا تھا۔ اپنی چھوٹی موٹی ریاستوں کو بچائے رکھنے کے لیے نواب اور راجے مہاراجے انگریزوں کی سیاسی برتری کو قبول کر کے اقتدار سے دست بردار ہو کر سیاسی غلامی کا طوق گلوں میں ڈال لیا تھا۔ چناں چہ دو چار دیسی ریاستوں کو چھوڑ کر باقی ریاستوں کے نام نہاد حکمرانوں نے جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بعض ریاستوں کی فوجوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور اپنے بھائی بندوں کا گلا کاٹ کر دوبارہ انگریزی اقتدار کو بحال کرنے کے لیے اتنی ہی شدت سے جنگ لڑی جتنی شدت سے انقلابی انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کے لیے لڑ رہے تھے اور پھر دہلی کی شکست اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری سے جنگ آزادی پر غیر معمولی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ دہلی کی شکست کا سب سے بڑا سبب مغل شہزادوں کا انتہائی غیر ذمہ دارانہ خود پسند رویہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی کبرسنی، غیر مستقل مزاجی، وزیر اعظم احسن اللہ خان اور ملکہ زینت محل کی سازباز سے انقلابی تحریک کو زبردست نقصان پہنچا۔ ایسے حالات میں عوام اور انقلابی سپاہیوں اور ان کے رہنماؤں نے جو کارنامہ انجام دیا وہ ناقابل فراموش ہے۔

جنگ آزادی کو منظم کرنے، سامان جنگ فراہم کرنے، سپاہیوں اور عوام میں جذبۂ حریت کو بیدار کرنے میں رہنماؤں نے شاندار روایات قائم کی ہیں اور ساتھ ہی مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک جھنڈے تلے ایک مقصد کے لیے جمع کرنے اور ان سے بہترین جنگی خدمات لینے میں مسلمان رہنماؤں اور خاص طور پر علماء نے انتہائی حکمت اور جنگی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا تھا اور خود میدان جنگ میں عام سپاہیوں اور مجاہدین کو جنگ کی آگ میں جھونک کر وہ پچھلی صفوں میں تماشائی بن کر نہیں بیٹھے بلکہ دین اور وطن کی حفاظت کے لیے اپنے خون کی قربانی بھی پیش کی۔ انتہائی نامساعد حالات میں اُنھوں نے ہتھیار ڈالنا یا گرفتار ہونا قبول نہیں کیا بلکہ سلطان شہید کے

نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مسکرا کر موت کو گلے لگالیا۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بوڑھوں نے بھی نوجوانوں سے بڑھ کر ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا۔ انقلابی حریت پسند انگریزوں کو ملک سے نکالنے میں ناکام ضرور ہوئے لیکن انگریزوں نے محسوس کرلیا کہ مسلمانوں کا جذبہ حریت اور جوش جہاد ایک ایسا طوفان تھا جس پر بند باندھے بغیر بیرونی سامراج کے ایجنٹ سکون سے ہندوستان پر راج نہیں کرسکتے تھے۔ صلیبی جنگیں تو دیومالائی قصوں کے مانند پرانی داستانیں بن چکی تھیں۔ پندرھویں صدی میں یورپ نے مسلم اسپین کو ختم کرنے کے لیے نہایت خون ریز جنگیں لڑی تھیں لیکن انگریزوں نے براہ راست مسلم عوام کے جوش جہاد کا سامنا نہیں کیا تھا۔ اٹھارویں صدی میں یورپ کے مرد بیمار (ترکی) کی بحری برتری کو ختم کرکے یورپ کے مہم جو بغیر روک ٹوک اسلامی ممالک کو پار کرکے بحرۂ ہند اور مشرق بعید کے سمندری راستوں پر اجارہ داری حاصل کررہے تھے۔ مشرق اور مشرق بعید میں کوئی بری یا بحری قوت ایسی نہیں تھی جو یورپ کے سامراجی مزاج کی قوتوں کو اپنی نوآبادیاں قائم کرنے سے روک سکے۔ چناں چہ بادی النظر میں انگریز سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھا کر اور چھوٹی چھوٹی کمزور حکومتوں کو دین سے غداروں کی مدد سے زیر کرلینے کے بعد وہ ہندوستان کے مالک بن چکے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں انگریزوں کی سیاسی لغت میں ایک انتہائی خوفناک لفظ کا اضافہ ہوا اور وہ تھا ''جہاد''۔ جس طبقے کو سیاسی اقتدار سے محروم کرکے انھوں نے اسے شکست خوردہ سمجھ لیا تھا وہ دین اور وطن کی حفاظت کے لیے اگر جذبۂ جہاد سے سرشار ہوجائے تو کتنا خطرناک اور ناقابل شکست ہوسکتا ہے اس کا اندازہ انگریزوں کو ہوگیا تھا۔

ہندوستان میں پست اقوام کو چھوڑ کر جنھیں برہمنیت نے کبھی انسانی درجہ تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا انگریزوں کے مقابل کھڑے ہونے والے مرہٹے، سکھ، گورکھے اور راجپوت ہوسکتے تھے اور اتفاق سے ان سارے طبقات کی مجموعی تعداد کے مقابل مسلمان اکثریت میں تھے اور وہ ماہر سیاست دان، بہترین مدبر، اعلیٰ درجے کے منتظم، فکری اور معاشی اعتبار سے نہایت مضبوط طبقہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک ایسے جذبے سے سرشار تھے جس کی طوفانی یورش پر وہ بے دریغ اپنی جان و مال کو قربان کرکے وطن اور اہل وطن کی عزت نفس کی حفاظت کرسکتے تھے اور مسلمانوں نے اس کی ایک جھلک ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں پیش کردی تھی۔

ماقبل جنگ آزادی۔ علماء کی سرگرمیاں:

عوام اور سپاہیوں میں جذبۂ جہاد کو بیدار کرنے کے لیے علماء دین کی سرگرمیاں ۱۸۵۷ء سے بہت

پہلے شروع ہو چکی تھیں۔ اس بارے میں ہنٹر نے سید احمد بریلوی کی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ [۲]

"انھوں نے ہندوستان میں ایک ایسا مذہبی انقلاب برپا کر دیا جس کی مثال اس کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہی انقلاب ہے جس نے پچاس سال سے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی روح کو دبنے نہیں دیا۔"

سید احمد کی تحریک کے تعلق سے اکثر مورخین اور تاریخ کے طالب علموں کا عمومی تاثر یہ ہے کہ یہ تحریک، انگریزوں کے خلاف نہیں تھی۔ اس تاثر کی وجہ یہ ہے کہ مورخین اور تاریخ کے طالب علموں کی توجہ تحریک مجاہدین کے ابتدائی دور ۱۸۲۶ء تا ۱۸۳۱ء پر ہی مرکوز رہی ہے۔ تحریک کے بانی سید احمد کے بعض ارشادات اور خاص طور پر ۱۸۴۵ء کے بعد تحریک کے عملی مظاہر کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ تحریک کی شروعات کا ایک مختصر سا خاکہ یوں ہے۔

سید احمد ۱۷ رجنوری ۱۸۲۶ء کو جہاد کا عزم کر کے مجاہدین کی ایک مختصری جماعت کے ساتھ رائے بریلی سے نکلے۔ سندھ اور بلوچستان سے گزرتے ہوئے درۂ بولان کو پار کیا اور کوئٹہ، قندھار، غزنی، کابل اور پشاور سے ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۲۶ء کو چارسدہ پہنچ کر وہاں کے آزاد علاقے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ صوبہ سرحد میں ہندوستانی مجاہدین کی آمد کی اطلاع پر پنجاب کے رنجیت سنگھ نے سکھ اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کیا اور فوجی کاروائی میں پہل کی۔ نومبر اور دسمبر میں سکھوں کی باضابطہ منظم فوج اور مجاہدین کے درمیان دو جھڑپیں ہوئیں۔ اس تصادم کے نتیجے میں ایسے ہنگامی حالات پیدا ہوئے کہ سید صاحب کے رفیقوں کو نظم و ضبط اور انتظامی امور کے لیے ایک آزاد حکومت کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چناں چہ ۱۱ رجنوری ۱۸۲۷ء کو ایک آزاد حکومت قائم کی گئی اور اُسی دن مجاہدین نے سید صاحب کو "سید بادشاہ" کا لقب دیا اور ان کے ہاتھ پر امامت جہاد کی بیعت کی۔ [۳]

۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۱ء تک مجاہدین اور سکھوں کے درمیان چند ایک چھوٹی بڑی جنگیں ہوئیں۔ ۱۸۳۱ء کی جنگ بالاکوٹ کی پہاڑیوں پر ہوئی اور اس جنگ میں سید احمد اور شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہید ہو گئے۔ تحریک مجاہدین کا یہ ابتدائی دور "سید بادشاہ" کی شہادت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور ۱۸۴۵ء کے بعد جب پنجاب پر سکھ اقتدار کا بھی خاتمہ ہو گیا تو سکھ مجاہدین کی آویزش کا دور بھی ختم ہو گیا۔ سکھ، مجاہدین کی آویزش تو ختم ہو گئی لیکن تحریک مجاہدین ختم نہیں ہوئی۔ ۱۸۴۵ء کے بعد یہ تحریک راست انگریزوں کے مقابل آ گئی۔ اگر بانی تحریک کے خطوط پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سکھ مجاہدین آویزش تو اس دور کے سیاسی حالات کا لازمی نتیجہ تھی۔ دراصل یہ تحریک تو

بیرونی سامراج کے خلاف جذبۂ جہاد کو بیدار کرنے کے لیے اٹھی تھی۔ مولانا سید محمد میاں صاحب نے سید احمد شہید کے خطوط کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے سلطان ہرات، والی کابل، شاہ بخارا، رئیس قلات، آزاد قبائل کے سرداروں، ہندوستان کے سربرآوردہ قائدین، علما، بعض فرما رواؤں اور سکھ حکومت کے ذمہ داروں کو لکھے تھے۔ ان خطوط میں ایک ہی مضمون بار بار دہرایا گیا ہے۔[۴]

''خدا گواہ ہے۔ ہمارا منشا نہ دولت جمع کرنا ہے، نہ اپنی حکومت قائم کرنا۔ ہم خدائے بالا و برتر کے ناچیز بندے ہیں۔ نہ بندگان خدا پر جبر وقہر کا کوئی وسوسہ ہمارے دل میں ہے اور نہ کسی کی حکومت چھین لینے کا کوئی جذبہ۔ ہمارا منشا وطن کو آزاد کرانا ہے اور بس اور یہ اس لیے کہ تقاضائے مذہب بھی ہے اور اسی میں رضائے مولیٰ مقصود ہے۔''

غلام رسول مہر صاحب نے بھی سید بادشاہ کے چند خطوط کا حوالہ دیا ہے۔ ایک خط جو ہندو راؤ کے نام ہے اس تحریک کے اصل مقصد کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔ ہندو راؤ گوالیار کے مرہٹہ سردار دولت راؤ سندھیا کا برادر نسبتی تھا۔ سید صاحب ہجرت کے سفر کے دوران گوالیار گئے تھے۔ ہندو راؤ نے آپ کا پرجوش استقبال کیا تھا۔ اور مجاہدین کے لیے بہت سارا سامان جنگ بھی بطور نذرانہ پیش کیا تھا۔ خط کا مضمون یوں ہے۔[۵]

''دو غیر جن کا وطن بہت دور ہے، بادشاہ بن گئے۔ جو تاجر سامان بیچ رہے تھے، انھوں نے سلطنت قائم کرلی۔ بڑے بڑے امیروں کی امارتیں اور رئیسوں کی ریاستیں خاک میں مل گئیں۔ ان کی عزت اور ان کا اعتبار چھن گیا۔ جو لوگ ریاست و سیاست کے مالک تھے وہ گمنامی کے گوشے میں بیٹھ گئے۔ آخر فقیروں اور مسکینوں میں سے تھوڑے سے آدمیوں نے کمر ہمت باندھی۔ ضعیفوں کا یہ گروہ محض خدا کے دین کی خدمت کے لیے اٹھا ہے۔ یہ لوگ نہ دنیا دار ہیں، نہ جاہ طلب۔ جب ہندوستان کا میدان غیروں اور دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ضعیفوں کی کوشش کا تیر مراد کے نشانے پر جا بیٹھے گا تو آئندہ کے لیے ریاست و سیاست کے عہدے طالبوں ہی کو مبارک رہیں۔''

غلام رسول مہر صاحب نے شاید اس خط کا کچھ حصہ حذف کر دیا ہے۔ مکمل خط کا حوالہ مولانا سید محمد

میاں نے دیا ہے۔ اس کا اختتامی حصہ ملاحظہ فرمائیے۔[۹]

"جس وقت ہندوستان کا میدان ان غیر ملکی دشمنوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششوں کا تیر مراد کے نشانے تک پہنچ جائے گا حکومت کے عہدے اور منصب ان کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہوں گے اور انھیں کی شوکت و عظمت کی جڑیں مضبوط کی جائیں گی۔ ہم کمزوروں کو بڑے بڑے رؤسا اور بلند مرتبہ عمائدین سے صرف اتنی بات درکار ہے کہ اہل اسلام کو ان کا دلی تعاون حاصل رہے اور مسند حکومت ان کو مبارک ہو۔"

ایک دوسرا خط جو سید صاحب نے ریاست گوالیار کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خان کے نام لکھا تھا اور حیدر خان کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی یہ باتیں ہندو راؤ کو سمجھا دی جائیں۔ اس خط کا حوالہ مولانا سید محمد میاں اور غلام رسول مہر دونوں نے دیا ہے۔ خط کے ابتداء میں وہی مضمون دہرایا گیا ہے جو ہندو راؤ کے خط میں مرقوم ہے۔ صرف اختتامی حصہ تھوڑا سا مختلف ہے لکھتے ہیں۔[۱۰]

"...... چوں کہ بڑے بڑے صاحب ریاست اُن کے مقابلہ کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ناچار چند کمزور ناچیز کمر ہمت کس کر کھڑے ہوئے ہیں۔ پس اس صورت میں رؤسا، عالی مرتبت پر لازم ہے کہ جس طرح وہ سالہا سال مسند حکومت پر متمکن رہے ہیں فی الحال ان کمزور فدا کاروں کی امداد میں پوری پوری کوششیں کریں اور اس کو خود اپنی حکومت کی مضبوطی کا ذریعہ سمجھیں۔"

ان خطوط میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اگر مجاہدین انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہندوستان کا سیاسی نقشہ کیا ہو گا۔ کیا سید بادشاہ کے ذہن میں ملوکیت کے احیاء کا تصور تھا؟ کیا وہ انگریزوں کو ہٹا کر تخت سلطنت پر کسی مسلمان کو بیٹھا دیتے یا خود حاکم بن جاتے؟ اور پھر سے ایک مسلمان حاکم کا دور شروع ہو جاتا۔ یہ بات دو وجوہات کی بنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ نمبر ۱: یہ خطوط ایک مرہٹہ سردار ہندو راؤ کو لکھے جا رہے تھے اور ہندوستان کے سارے رؤساء عالی مرتبت سے امداد کی درخواست کی جا رہی تھی۔ اور نہ کسی مخصوص شخص کی بادشاہت کے لیے یہ تحریک اٹھی تھی، ایسا کوئی اشارہ ان خطوط میں نہیں پایا جاتا۔ اور نمبر ۲: سید صاحب کی تحریک دراصل شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک کا عملی مظاہرہ تھی۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب "البدور البازغہ" میں ترقی پذیر متمدن حکومت کا نقشہ پیش کیا ہے۔[۱۱] شاہ صاحب فرماتے

ہیں کہ نرقہ یا خاندان اور رنگ و نسل کے امتیاز سے بالا ہو کر حکومت کے مختلف شعبوں اور صدارت یا وزارت عظمیٰ کے لیے اشخاص کا انتخاب کیا جانا چاہیے جو صلاحیت اور انتظامی قابلیت میں ممتاز ہوں۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ایک شعبے کے لیے موزوں شخص کو تلاش کیا جائے تو دوسری صورت یہ ہوگی کہ عوام کی مقبول اور منتخب جماعت حکومت کی ذمہ دار ہوگی۔ ظاہر ہے سید صاحب کے پیش نظر شاہ ولی اللہ کے اس انقلابی منصوبے کا نقشہ ضرور رہا ہوگا۔ اسی لیے وہ بے دھڑک ایک ہندو امیر اور تمام سیاست دانوں کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ حکومت تم لوگوں کو مبارک ہو۔ ہمیں تو انگریزوں کو اس ملک سے نکالنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ کیوں مجاہدین کے مقابلے پر آ گئے۔ یہ اس دور کی سیاسی بازی گری کا شاخسانہ ہے۔ انگریزوں کی '' پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' والی پالیسی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ اور پھر ظاہر ہے سرحدی علاقے میں ایک آزاد حکومت کھلا اقتدار کے لیے بہت بڑا خطرہ ضرور تھی۔ اگر اس حکومت کے تحت سرحدی پٹھان منظم ہو جاتے تو ایک ناقابل تسخیر قوت وجود میں آتی۔

ایک اور خط جو شاہ محمود درانی والی ہرات کے فرزند شہزادہ کامران کے نام لکھا گیا تھا سید صاحب کی تحریک جہاد کے مقصد کا نہایت واضح اعلان ہے۔ خط کے ابتدائی حصہ میں وہی مضامین بیان کیے گئے ہیں جو دوسرے اکابرین کے خطوط میں درج ہیں۔ اور پھر آخر میں لکھتے ہیں۔ ۸

> '' پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا تاکہ وہاں سے اہل کفر و طغیان کو ختم کیا جا سکے اور میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے، یہ نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کر لوں۔''

جنگ آزادی سے صرف ۲۵،۲۰ سال قبل اٹھنے والی اس تحریک نے ہندوستانی علماء کو یقیناً متاثر کیا ہوگا۔ جہاد کے مقصد کا یوں برملا اعلان اور پھر ہزاروں مجاہدین کی قربانیوں کی داستانیں ہندوستان کے طول و عرض میں گردش کرتی رہی ہوں گی۔ چناں چہ جنگ آزادی کے رہنماؤں کے لیے یہ تحریک ایک ہراول موج کی حیثیت رکھتی ہے۔

علمائے عظام جنھوں نے جنگ آزادی میں عملی حصہ لیا:

جنگ آزادی میں علماء نے تلوار کیوں اٹھائی؟ اسلام تو امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔ اسے تلوار سے کیا واسطہ! ایک عام مسلمان اگر تلوار اٹھائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اسے شاید اسلام کے معنی نہیں معلوم

لیکن عالم تو اسلام کے معنی جانتا ہے۔ اس کے باوجود تلوار اٹھا لیتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ غیر اللہ کی طاقت پر بھروسہ مت کرو۔ ظالم اور جابر کے سامنے جھکنے کے بجائے حق کے لیے خود کو قربان کر دو۔ یہی جہاد کا فلسفہ ہے۔ جب ظالم اور جابر کا ظلم اور ناانصافی کی حد اپنے حدود سے تجاوز کر جائے تو پھر علماء کی ذمہ داری ٹھہرتی ہے کہ وہ ظالم اور جابر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور عوام کی رہنمائی بھی کریں۔ چناں چہ اس فلسفے نے علماء کو متحرک کیا اور تاریخ کے مطالعہ پر جن علماء نے قلم ہاتھ سے رکھ کر تلوار اٹھالی ان کے نام ذیل میں درج کیے جاتے ہیں[9]

۱- مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادی: جنگ آزادی کے صف اول کے رہنما۔ مولانا نے وسط ہند اور اودھ کی ساری جنگوں میں حصہ لیا۔ قصبہ محمدی میں ایک آزاد حکومت قائم کی۔ کالن کیمبل نے قصبہ محمدی پر حملہ کر دیا۔ سپاہیوں اور ہتھیاروں کی کمی کے باعث مجاہدین پریشان تھے۔ مولانا نے پوائن کے راجہ سے مدد مانگی پوائن کا راجہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس نے مولانا کو پوائن آنے کی دعوت دی اور مدد کا وعدہ کیا۔ جب مولانا وہاں پہنچے تو قلعہ کے اوپر سے ان پر حملہ کیا گیا۔ مولانا پوائن کے قلعہ کے سامنے شہید ہو گئے۔

۲- مولانا فضل حق خیر آبادی: اکثر دیسی والیان ریاست کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ جنرل بخت خان کی فوج کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں دہلی آئے اور جہاد کا فتویٰ مرتب کر کے پیش کیا۔ دہلی شکست کے بعد اپنے خاندان کو لے کر دہلی سے نکل گئے۔ ۲ سال تک خانہ بدوش زندگی گزاری، نومبر ۱۸۵۸ء میں گرفتار ہوئے۔ لکھنؤ میں مولانا پر مقدمہ چلایا گیا اور کالے پانی کی سزا دی گئی۔ ساری عمر سزا کاٹ کر ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔

۳- حضرت حاجی امداد اللہ: شاملی کی جنگ میں مجاہدین کی رہنمائی کی۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد آپ مکہ معظمہ چلے گئے۔ حاجی صاحب سید احمد شہید کی تحریک سے متعلق رہے۔ ۱۸۶۷ء میں وفات پائی۔

۴- مولانا محمد قاسم نانوتوی: جنگ آزادی میں اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداد اللہ کے ساتھ کام کیا اور شاملی کی جنگ میں شامل رہے۔ ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔

۵- مولانا رحمت اللہ کیرانوی: شاملی کے معرکہ میں دوسرے علماء کے ساتھ آپ بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ کیرانہ ضلع مظفر نگر میں انگریزی فوجوں سے مقابلہ کیا اور مجاہدین کی رہنمائی کی۔ آپ کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری تھا۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے آپ مکہ معظمہ چلے گئے۔

۶- مولانا الحاج رشید احمد گنگوہی: حاجی امداداللہ کے خلیفہ تھے۔ شاملی کے جہاد میں شریک تھے۔ جنگ کی سرگرمیاں ختم ہونے کے بعد گرفتار ہوئے۔ مظفرنگر جیل میں رکھے گئے۔

۷- مولانا مظہر اور مولانا منیر: شاملی کی جنگ میں حاجی امداداللہ کے ساتھ تھے۔

۸- مولانا سید اسحاق ٹونکی: دہلی کے معرکوں میں ایک فوجی دستے کے افسر رہے۔

۹- مولوی لیاقت علی: الہ آباد کی شکست کے بعد نانا صاحب کے ساتھ رہے۔ سید احمد شہید کی تحریک سے متاثر تھے۔ قصبہ محمدی میں احمد اللہ شاہ کی آزاد حکومت میں بھی شریک تھے۔ انقلابی رہنماؤں کے ساتھ نیپال چلے گئے تھے۔ لیکن وہاں زیادہ دن نہیں ٹھہرے رہے۔ ہندوستان واپس ہونے کے بعد بمبئی میں گرفتار ہوئے۔ الہ آباد لا کر ان پر مقدمہ چلایا گیا اور کالے پانی کی سزا ہوئی۔ وہیں ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔

۱۰- مولوی وہاج الدین عرف منو: مرادآباد میں انقلابیوں کی رہنمائی کی۔ جب نواب رام پور کی فوج مجاہدین کی سرکوبی کے لیے مرادآباد پہنچی تو آپ نے نواب رام پور کی فوج سے مقابلہ کیا۔

۱۱- مفتی عنایت احمد کاکوروی: بریلی اور رام پور میں آپ کی سرگرمیاں رہیں۔ آپ خان بہادر خان کے ساتھ تمام معرکوں میں حصہ لیا۔

۱۲- مولوی رضی اللہ بدایونی: بدایوں کے صدیقی شیخ تھے۔ جنگ میں عملی طور پر سرگرم حصہ لیا۔ جنگ کے بعد گرفتار ہوئے اور موت کی سزا دی گئی۔

۱۳- شاہ غلام بولن سیوہاروی: مرادآباد کی انقلابی فوج میں شامل تھے۔ جنگ کے بعد گرفتار کیے گئے۔ اور انڈمان بھیج دیے گئے۔

۱۴- مولوی کفایت علی کافی: نواب مجو خان کی آزاد حکومت میں صدر شریعت کے عہدے پر فائز رہے۔ مرادآباد میں انقلابیوں کی ناکامی کے بعد گرفتار ہوئے اور مرادآباد جیل کے سامنے پھانسی دی گئی۔

۱۵- مولانا یحییٰ علی: تحریک مجاہدین کے بے مثل کارکن۔ انبالے کے مقدمے میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ اس سزا پر بے انتہا خوشی کا مظاہرہ کیا کہ شہادت کا درجہ ملے گا۔ یہ دیکھ کر جج نے سزا بدل دی اور جلاوطن کر کے انڈمان بھیج دیے گئے۔

۱۶- مولانا فیض احمد بدایونی: آگرے میں انقلابی عوام اور فوج کی کمان سنبھالی۔ بیگم

حضرت محل اور مولانا احمد اللہ شاہ کے ساتھ تمام معرکوں میں شامل رہے۔ بیگم حضرت محل کی فوج کے ساتھ نیپال چلے گئے۔

۱۷- مولانا سید عالم علی : مراد آباد کے امام شہر تھے۔ تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ انگریزوں نے مجرموں کی جو فہرست تیار کی تھی اس میں آپ کا نام تھا۔ لیکن سرسید احمد خان کی کوششوں سے چھوٹ گئے۔

۱۸- مولوی علاء الدین : دکن کے مشہور علماء میں سے تھے۔ حیدر آباد دکن کے انقلابی عوام نے انھیں کی قیادت میں انگریز رزیڈنسی پر حملہ کیا تھا۔

۱۹- مولانا جلیل : علی گڑھ کے امام شہر اور خطیب۔ جنگ کا بگل بجتے ہی پانچ ہزار مجاہدین کے ساتھ میدان میں آئے۔ اور انگریزوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

۲۰- مولوی واعظ الحق : پٹنہ کے مشہور عالم اور تحریک ولی اللہی کے خاص رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ بہار کی تمام خفیہ مجالس میں شریک رہے۔ تحریک کی ناکامی کے بعد وہ مکہ معظمہ چلے گئے۔

۲۱- مولوی عبدالقادر لدھیانوی : پنجاب میں آزادی کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں اپنے بیٹوں کے ساتھ حصہ لیا۔ تحریک کی ناکامی کے بعد دہلی آگئے اور روپوش ہو گئے۔

۲۲- سید محمد امین غازی : امروہہ کے سادات خانوادے کے فرد۔ سید احمد شہید کے ساتھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عملی حصہ لیا۔

حوالہ جات

۱- ہمارے ہندوستانی مسلمان : صفحہ ۱۷۲، ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر (مترجم: ڈاکٹر صادق حسین) : مطبوعہ: الکتاب انٹرنیشنل، مرادی روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵، بار اول ۲۰۰۲ء

۲- ہمارے ہندوستانی مسلمان : صفحہ ۷۰، ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر (مترجم: ڈاکٹر صادق حسین) : مطبوعہ: الکتاب انٹرنیشنل، مرادی روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵، بار اول ۲۰۰۲ء

۳- سید احمد شہید صفحہ ۳۵۲: غلام رسول مہر : ناشر: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، (مطبع علمی پرنٹنگ پریس، لاہور) جلد اول و دوم : اشاعت سوم ۱۹۶۸ء

۴- علماء ہند کا شاندار ماضی : جلد ۴، ہندوستانی مسلمان اور تحریک آزادی : صفحہ ۳۱۷، مولانا سید محمد میاں : مطبوعہ : الجمعیۃ پریس، دہلی، ۲۶ جولائی ۱۹۵۷ء

۵- جماعت مجاہدین : صفحہ ۱۳: غلام رسول مہر، ناشر : کتاب منزل کشمیری بازار، لاہور، (مطبع علمی پرنٹنگ پریس، لاہور) ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۵ء

۶- علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد ۴، ہندوستانی مسلمان اور تحریک آزادی : صفحہ ۳۱۹ اور ۳۲۰، مولانا سید محمد میاں : مطبوعہ : الجمعیۃ پریس دہلی، ۲۶ر جولائی ۱۹۵۷ء

۷- علماء ہند کا شاندار ماضی، جلد ۴، ہندوستانی مسلمان اور تحریک آزادی : صفحہ ۳۲۱، مولانا سید محمد میاں : مطبوعہ : الجمعیۃ پریس دہلی، ۲۶ر جولائی ۱۹۵۷ء

۸- جماعت مجاہدین : صفحہ ۱۵: غلام رسول مہر، ناشر : کتاب منزل، کشمیری بازار، لاہور، (مطبع علمی پرنٹنگ پریس، لاہور) ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۵ء

۹- جنگ آزادی اٹھارہ سو ستاون : صفحہ ۳۵۷ تا ۳۷۱، خورشید مصطفیٰ رضوی، مطبوعہ : الجمعیۃ پریس، دہلی، (مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-۶)، مطبع اوّل اپریل ۱۹۵۹ء

☆☆☆

محمد مظفر الدین فاروقی صاحب کی کہانیوں میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے عوامل کارفرما ہیں، ان میں گہرائی فکر، قوت اظہار، انفرادی بصیرت، عصری آگہی اور پیش بینی کو بہت دخل ہے۔ ان کی کہانیوں میں گہرا تاریخی شعور موجود ہے۔ کہانیوں کے مواد اور اسلوب میں ایسی انفرادیت ہے جس نے انھیں اردو کے افسانہ نگاروں میں ممتاز ترین حیثیت دلادی ہے۔ ان کے فکر و خیال میں گہرائی، حقیقت پسندی اور ندرت ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندوستانی معاشرت، نسلی، مذہبی اور طبقاتی تعصب کے ناپسندیدہ عناصر کو نہایت خوب صورتی اور فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

زیر نظر کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عمومی رول کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سامراجی حکومت کے ظالمانہ نظام سے پیدا ہونے والے نتائج اور پھر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے پیش نظر، جنگ کی تیاری، پلاننگ اور عسکری جدوجہد کی تفصیلات کے ساتھ ہندوستانی علماء کے رول کو تاریخی حقائق کی روشنی میں بہت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

• خلیق انجم

Scanned by CamScanner